

کوزہ و تر

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
عَلَّامِ صَيْرُ الدِّينِ صَيْرُهُ نَقْرًا
رَبِّ الْقَوْمِ
حَكِيمِ الْقَائِدِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

کوزہ کوثر

(مقالاتِ نصیری)

بیتِ ارضینا

علامہ نصیر الدین نصیر ہونڈا

بیتِ القوم

حکیم الفلم

شائع کردہ

خانہٴ حکمت کی ادارہٴ عارف

۳۔ اے، نور ویلا۔ ۲۶۹۔ گارڈن ویسٹ کراچی ۳۰۔ پاکستان

خدمتِ قرآن اور حکمتِ قرآن

اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے، اور جس کو حکمت عطا کی گئی اسے خوبوں کی بڑی دولت ہاتھ لگی، اور عقلمندوں کے سوا کوئی نصیحت مانتا ہی نہیں (۲۶۹) یٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا = وہ حکمت دیتا ہے۔ دینے کا تعلق ید اللہ سے ہے، اور اس کا مشاہدہ مرتبہ عقل پر، جہاں بے شمار حقائق و معارف مرکوز ہیں، وہاں اَلْمَثَلُ الْاَعْلٰی (۱۶) بھی ہے، جس میں وہ تمام مثالیں جمع ہیں جو قرآن حکیم میں بیان کی گئی ہیں۔

اب خدمتِ قرآن کی بات کرتے ہیں اور یہ شروع سے لے کر اب تک ایک وسیع کائنات ہے جس میں ہرگز نہ خدمت کی گنجائش ہے، اور اس میں ہمیں اور ہمارے عزیز ساتھیوں کو ”حکمتِ قرآن“ کی خدمت سونپی گئی ہے، نہ ہے نصیب!

سدا بہار پھولوں کا یہ گلہ ستہ میں صدر فتح علی حبیب، صدر محمد عبد العزیز، صدر بابر خان، دیگر عملداران اور تمام ارکان کی جانب سے عزیزم نوشاد پنجوانی کو پیش کرتا ہوں، قبول ہو! میرے بہت ہی عزیز جانی دوست، میرے دل کے لیکن اور میرے بہت پیارے سٹوڈنٹ نوشاد کی (انشاء اللہ تعالیٰ) بہت ترقی ہوگی، ان کا پہلا انتساب مفتاح الحکمت میں دیکھیں۔

ن۔ن۔ (حُطَّ عَلٰی) ہونزائی

کراچی - ۲۴/۶/۹۴

اعادلو هو اقرب للتقوى
عدل کرو۔ یہی تقویٰ کے قریب ہے۔

H. R. H. PRINCE KARIM AGA KHAN

● ISMAILIA LOCAL COUNCIL ●

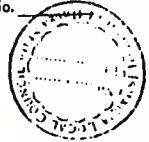
HYDERABAD ● HUNZA STATE

ہزاراٹل ہائیڈرس پرنس آغا خان اسماعیلیہ لوکل کونسل۔ حیدر آباد۔ ہنڑہ سٹیٹ

Place حیدرآباد

Date 13-12-70

No.



ٹائٹل سرٹیفکیٹ

جہاں اسماعیلیہ حیدرآباد باگھوس و اکثر جماعت ہنڑہ بالعموم کی اسٹون اور
مقدمہ نصر الدین نصر شیرازی کی اہلی ولسانی خدمت کے عرف آج جوڑو 13 دسمبر
مہرقتہ ساڈو یوم سید انش ایام زمان (برقہ ڈے) نہایت اسماعیلیہ لوکل کونسل
حیدرآباد۔ ہنڑہ سٹیٹ۔ خاص مرزوں ٹائٹل (کٹ) بابائے برہنہ
مقدمہ مذکورہ کو پیش کیا جاتا ہے۔ بھر کونسل مذکورہ دہرہ کٹھ محمد جاوید
نش ایڈوانس کونسل میں پرانکار ڈ محفوظ ہے۔

محمد ابرہیم
13-12-70

محمد ابرہیم۔ آر۔ اے۔ پرنس آغا خان
اسماعیلیہ لوکل کونسل حیدرآباد۔ ہنڑہ

ISMAILIA LOCAL COUNCIL
HYDERABAD, HUNZA STATE

ALLAMAH NASIRUDDIN. S.B
HYDERABAD, HUNZA STATE.

فہرست مقالات

صفحہ	مقالہ	شمار
۷	دیباچہ طبع دوم	۱
۱۳	پیش لفظ	۲
۳۶	ذکر الہی میں شفاء	۳
۲۴	نعت نبی اکرمؐ	۴
۲۸	سرورِ رسل کے وزیر	۵
۴۵	قرآن کی تنزیل اور تاویل	۶
۵۱	میلاد الامام الحاضرؑ	۷
۵۵	امام برحق کا دیدار فیضِ آثار	۸
۶۳	قصیدہ منتخب	۹
۷۰	جشن نوروز کا ایک اور پہلو	۱۰
۷۹	اتحاد المسلمین	۱۱
۸۰	آبِ شفاء	۱۲
۸۶	اسماعیلی تاج و طغرا	۱۳
۹۴	اسماعیلی پر حیم	۱۴

صفحہ	مقالہ	شمار
۱۰۲	صراطِ مستقیم	۱۵
۱۱۲	(نظم) منقبت (بابِ الحکمت)	۱۶
۱۱۹	اصول و فروع دین	۱۷
۱۳۲	(نظم) امامِ زمان کے معجزانہ نشانات	۱۸
۱۳۶	آیاتِ دُعا کے بنیادی حقائق	۱۹
۱۴۵	تاویلِ استرجاع	۲۰
۱۵۱	(نظم) ہمتِ مردانِ مددِ خدا	۲۱
۱۵۳	توحید	۲۲
۱۵۸	(نظم) شاہ! سلامِ علیک	۲۳
۱۶۴	مشاہدہٴ نور	۲۴
۱۷۲	مصنّف کے متعلق پاکستان کے بعض سر بلند دانشوروں	۲۵
	کی آراء	
۱۷۹	پہلا دیوار اور پہلی کرامت	۲۶

دیباچہ طبع دوم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ اللہ تعالیٰ کا پاک ارشاد ہے : **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ** فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا

(۴/۵۹)

ترجمہ: اے ایمان دارو! اللہ کی اطاعت کرو، اور رسول کی، اور جو تم میں سے صاحبانِ امر ہیں ان کی اطاعت کرو، پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو، اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو، یہی ایک صحیح طریق کار ہے، اور تاویل کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔

حکمتِ اول: اللہ تبارک و تعالیٰ کا یہ ہمہ گیر و ہمہ رس حکم انتہائی اہمیت کا حامل ہے، کیونکہ اس میں خدائے بزرگ و برتر کی اطاعت و فرمانبرداری کا وہ اہل قانون مذکور ہے، جو شروع سے لے کر آخر تک تمام مسلمانوں کیلئے بچد ضروری اور لازمی ہے۔

حکمتِ دوم: خدائے علیم و حکیم نے کبھی اہل ایمان کو کسی ایسے شخص

کی اطاعت کا حکم نہیں دیا، جس کو اُس نے نورِ علم و ہدایت کی لازوال دولت سے مالا مال نہ فرمایا ہو۔

حکمتِ سنوم : مسلمانوں کی وحدت و سالمیت کا سب سے بہترین اور مثالی زمانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عہدِ مبارک تھا، جس میں سوائے اہل بیتِ اطہار کے کوئی ایسا مسلمان بادشاہ یا حاکم نظر نہیں آتا کہ رسولِ ص کی اطاعت کے بعد اس کی اطاعت کی گئی ہو۔

حکمتِ چھارم : یہ بات صرف اہل حقیقت ہی کے لئے خاص ہے کہ **أُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ** (صاحبانِ امر جو تم میں سے ہیں) کے ایک انتہائی معنی بھی ہیں، وہ یہ کہ جب عالمِ شخصی کے اسرارِ منکشف ہو جاتے ہیں، تو اُس وقت یہ حقیقتِ حال روشن ہو جاتی ہے کہ زمانے کے ولیِ امر کا نورِ ظہر اُردو باطناً منکم کا مصداق ہے۔

حکمتِ پنجم : امر کے بغیر کوئی اطاعت نہیں، لیکن امر دراصل خدا ہی کا ہے، لہذا رسولِ اکرم کے بعد صرف وہی حضراتِ امیرِ الہی کے حال ہو سکتے ہیں، جو نورِ خدا کے حامل ہیں، اور وہ آئمہ آلِ محمد ہی ہیں، جن کا پاک سلسلہ حَبْلِ اُمَّد (خدا کی رستی) کا مرتبہ رکھتا ہے۔

حکمتِ ششم : یہاں یہ بڑا اہم سوال سامنے ہے کہ حضورِ انور کی رحلت کے بعد مسلمانوں کے آپس میں جو اولین نظرِ باقی تنازع پیدا ہوا، وہ کس چیز کے بارے میں تھا؟ اس کا جواب آیہ اطاعت کے اشارے کے مطابق یہ ہے کہ نزاع کسی اور شے میں نہیں، صرف اولوالمر کے تعین و تقرر کے بارے

میں تھا، حالانکہ قرآن و حدیث میں اس حقیقت کی بہت سی روشن دلیلیں موجود ہیں، پس فرمایا گیا کہ تم تمام چیزوں کو چھوڑ کر نئے سہرے سے قرآن و حدیث میں دیکھو کہ اولوالعزم کون ہیں؟

کتاب کا نام

یہ نتیجہ غور و فکر اس کتاب کا موجودہ نام "کوثر کوثر" رکھا گیا، جبکہ پہلے اس کا نام مقالات نصیری تھا، یقیناً کوثر مولانا علی کا لقب بھی ہے، اور حضرت قائم القیامتؑ کے علم تاویل کا پانی بھی، یہ مقدس پانی ایسا اور اتنا بابرکت ہے کہ اس کا صرف ایک گھونٹہ دریا تھے روان سے بہت زیادہ ہے، آب حیات بحقیقت یہی ہے جس کے پینے سے مومنین و مومنات اپنے آپ کو ازل و ابد میں زندہ اور پُر نور پاتے ہیں۔

حقیقی علم اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک نُور ہے، جس کی روشنی میں ہر چیز کی حقیقت کا پتہ چلتا ہے، یہ دیدہ دل، گوشِ ہوش، اور لسانِ ناطق ہے، روحانی علم سچِ سچ بہشتِ برین ہے، جس میں ہر لطیف نعمت موجود ہے، اور کوئی بڑی یا چھوٹی شے ایسی نہیں جو اس میں نہ ملے، علم و حکمت بہت بڑی دولت ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتی، آپ اس سے عالمِ اسلام کی خاموش خدمت کر سکتے ہیں، کیونکہ آپ علیؑ زمانِ صلوات اللہ علیہ و سلامہ کے علمی شکر میں شامل ہیں۔

اگر آپ امامِ برحقِ علیؑ سلام کے جان نثار عاشقوں میں سے ہیں، تو

آئیے! ہم سب مل کر ایک بید ضروری اور ہمہ رس کام کریں، جس کا فائدہ نہ صرف جماعت تک محدود ہو، بلکہ یہ تمام اسلام کی بھی ایک اہم خدمت قرار پائے، اور کچھ آگے چل کر یہی عمل انسانیت کے لئے بھی مفید ثابت ہو جائے گی۔ یہ سچ ہے، ایسا عظیم کارنامہ علمی خدمت کی شکل میں ہو سکتا ہے۔

قرآنِ عظیم نے واشگاف الفاظ میں اعلان فرمایا کہ حکمت ہی میں خیر کثیر کی لازوال دولت موجود ہے، ایسے میں اگر ہم قرآنی حکمت کی خدمت سے پیچھے ہٹیں تو بہت بڑی ناشکری ہوگی، اور قیامت کے دن بڑی سختی کے ساتھ ہم سے پوچھا جائے گا۔

لفظِ معراج کی حکمت

قرآنِ عزیز اور دینِ اسلام میں لفظ ”معراج“ کے معنی اور مثال میں عظیم حکمتیں پنہان ہیں، کیونکہ حضرت محمد مصطفیٰ سرورِ انبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پاک روحانی سفر اسی (معراج) کے عنوان سے ہے، معراج کا لفظی ترجمہ ”سیڑھی“ ہے، اور یہ بات پوشیدہ نہیں بلکہ ظاہر ہے کہ سیڑھی جتنی اونچی ہوگی، اُتنے اُس کے زینے زیادہ ہوں گے، اس مثال سے دین اور رُوحانیت کے درجہ ترقی مراد ہیں، جن کا کئی طرح سے قرآنِ پاک میں ذکر موجود ہے (درجات، معراج)۔

عزیزانِ من! میں آپ سے ایک بہت ہی مفید علمی سوال کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ جب آپ سورۃ فاتحہ میں ربّانی تعلیم کے مطابق تسلّم انبیاء علیہم السلام کے لئے مقرر شدہ راستے پر چلنے کی توفیق و ہدایت کی

دعا کرتے ہیں، تو بتائے کہ اس مقدس راستے کی منزل مقصود کہاں ہے؟ اسکا کیا نام ہے؟ ویسے تو سب کو معلوم ہے کہ آنحضرتؐ نے معراج تک رہنمائی فرمائی ہے۔

سوئی کے ناکہ سے اونٹ کا گزرنا

سُورَةُ اَعْرَافٍ (بچ) میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: (ترجمہ) یقین جانو! جن لوگوں نے ہماری آیات (نورِ مُنْتَرِل) کو جھٹلایا ہے، اور ان کے مقابلے میں سرکشی کی ہے، ان کے لئے آسمان کے دروازے ہرگز نہ کھولے جائیں گے، ان کا جنت میں جانا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا سوئی کے ناکہ سے اونٹ کا گزرنا (بچ) سوئی کا ناکہ دعوتِ حق کا انتہائی چھوٹا سا دروازہ ہے، اور اونٹ سے وہ شخص مُراد ہے جو اپنے آپ کو بہت بڑا اور داعی کو بہت حقیر سمجھ کر دعوتِ حق کو قبول نہیں کرتا، جیسا کہ مذکورہ آیت میں تکبیر (وَاسْتَكْبَرُوا) کا ذکر ہے، پس اگر یہ شخص فخر و غرور سے باز آئے، اور عاجزی سے معلم کی تعلیم قبول کرے تو اس حال میں سوئی کے ناکہ سے اونٹ گزر جائے گا، کیونکہ ایسے میں گویا اونٹ بہت چھوٹا ہو گیا، اور سوئی کا ناکہ بہت کشادہ ہو گیا۔

مضبوط اور مشکل حجابات

جس طرح خدا پردے کے پیچھے سے کلام کہتا ہے (۲۱) اسی طرح قرآن حکیم کے بڑے بڑے اسرار مضبوط اور مشکل حجابات میں ہیں، پناہِ قصۃ

ذوالقرنین کا ایک ایسا حجاب عین حَمِيَّة (کچھڑ والا چشمہ ۱۸) ہے جس سے عالمِ علوی میں نفسِ کُلّی اور عالمِ سفلی میں اساس اور امام مُراد ہیں، جن میں آفتابِ نورِ غروب ہو جاتا ہے، اس تاویلی حکمت کے برعکس سیارہٴ زمین پر کچھڑ کا کوئی ایسا چشمہ موجود نہیں، جس میں ظاہری سورج ڈوب جاتا ہو۔

یاد رہے کہ مٹی مومن کی مثال ہے، اور پانی علم کی مثال، مٹی کی خوبی یہ ہے کہ وہ پانی کو قبولتی ہے، جس سے وہ بصورتِ نباتاتِ زندہ ہو جاتی ہے اور مومن کی خوبی یہ ہے کہ وہ علم کو قبول کرتا ہے، جس میں اس کی اصل زندگی ہے، پس مطلوب مٹی ایسا مومن ہے، جس کے پاس تھوڑا سا علم ہو، گارا وہ مومن ہے، جس نے زیادہ علم جذب کر لیا ہو، اور کچھڑ جس میں بہت زیادہ پانی ہوتا ہے، اعلیٰ حدِ ود کی مثال ہے، کیونکہ ان کا علم بڑا وسیع ہوتا ہے، لہذا وہ آفتابِ نورِ عقل کے لئے مغرب ہیں۔

مشارق و مغارب کی حکمت

قرآنِ پاک میں کئی مشرقوں اور مغربوں کا ذکر آیا ہے (۱۳، ۱۴، ۱۵) جس کی ایک تاویلی حکمت اس طرح ہے: عقلِ کُلّ و نفسِ کُلّ = مشرق و مغرب، نفسِ کُلّ و ناطق = مشرق و مغرب، ناطق و اساس = مشرق و مغرب، اساس و امام = مشرق و مغرب، امام و باب = مشرق و مغرب، باب و حجت = مشرق و مغرب، حجت و داعی = مشرق و مغرب، داعی و ماذون = مشرق و مغرب، ماذون و مستجیب = مشرق و مغرب، پس عالمِ دین اور عالمِ شخصی کے مشارق و مغارب

یہی ہیں، جہاں نورِ علم طلوع و غروب ہوتا رہتا ہے۔

اے عزیزانِ ودوستان! اے جماعتِ باسعادت! اس بے مثال خوش بختی کا کیا کہنا، کہ آپ سب اپنے زمانے کے امامِ مہم علیہ السلام کو پہچانتے ہیں، اور یقیناً اسی معنی میں آپ حضرات اللہ تعالیٰ کو اسماء الحسنیٰ سے پکارتے ہیں، خدا کا یہ پستیدہ عمل آپ کو مبارک ہو، اب اس انتہائی عظیم نعمت کی شکرگزاری کے طور پر خلقِ خدا کی خیر خواہی لازمی ہے۔

آئیے امر میرے لئے از بس ضروری ہے کہ میں اپنے ان تمام ساتھیوں کا قلبی گہرائیوں سے شکریہ ادا کروں، جن کی شب و روز کی انتہک کوشش و محنت کی وجہ سے ہمارے تینوں ادارے نیک نام ہو گئے، وہ ہیں: خانہٴ حکمت، عارف، اور بی۔ آر۔ اے۔ نیز میں بہت بہت بہت شکر گزار اور ممنون ہوں، ان تمام جہان نثار عزیزوں کا، جو "جشنِ خدمتِ علمی" کو دور رس فوائد کی شان کے ساتھ منانے کے لئے کمر بستہ ہو چکے ہیں، خداوندِ عالم سب پر بے تہایت مہربان ہو!

نصیر الدین نصیر (حُب علی) ہونزائی

کراچی

منگل ۳۰ شوال ۱۴۱۴ھ / ۱۳ اپریل ۱۹۹۴ء

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

پیش لفظ

بارگاہِ الہی میں دعا:

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ ۝۹

اے ہمارے پروردگار! تو ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو جنہوں نے ایمان لانے میں ہم سے سبقت کی ہے، بخش دے، اور ہمارے دلوں میں ان لوگوں کے لئے جو ہمارے پروردگار پر ایمان لائے ہیں، کوئی کینہ نہ رہنے دے، بے شک تو بڑا شفیق نہایت رحم والا ہے۔

آنحضرتؐ کی تعریف و توصیف:

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ ۝۹

(اے لوگو! تمہارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں جو تمہاری جنس (بشر) سے ہیں، جن کو تمہاری

مفرت کی بات نہایت گران گذرتی ہے جو تمہاری منفعت کے بڑے خواہشمند ہوتے ہیں، ایمانداروں پر تو بڑے شفیق و مہربان ہیں۔

محمد و آل محمد پر صلوة:

صَلَوَاتُ اللَّهِ وَصَلَوَاتُ مَلَائِكَتِهِ وَأَنْبِيَائِهِ وَرُسُلِهِ وَجَمِيعِ خَلْقِهِ عَلَى مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ وَالسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَعَالِيهِمْ وَرَحْمَةُ اللَّهِ وَبَرَكَاتُهُ۔ اللہ تعالیٰ کی صلوات ہو اور اس کے ملائکہ انبیاء و رسل اور تمام خلق کی صلوات ہو محمد و آل محمد پر! اور آنحضرت اور آپ کے آل پاک پر سلام ہو، اور ان پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں!

اسماعیلی مذہب کی خوبیاں:

میرے دینی بھائیوں اور عزیزوں کو اس میں ذرا بھی شک نہ ہو گا کہ اسماعیلی مذہب علم و حکمت کے بے باجواہر کے گنجینوں اور رشد و ہدایت کے انمول موتیوں کے خزانوں سے دائم الوقت مالا مال ہے، یہ لاقانی و لاثانی علمی مال و دولت کتابی دفتیوں میں بھی رہی ہے، اور پاک و صاف سینوں میں بھی، اسماعیلیوں کا یہ عقیدہ درست اور یہ دعویٰ حق بجانب ہے، اور تاریخ امامت سے بھی یہی ثبوت ملتا ہے کہ اسماعیلی علم و حکمت کے چراغ کی ضوفشانیوں سے دُنیا کی آنکھیں اُس وقت خیرہ ہونے لگی تھیں جبکہ مولانا حسین علیہ السلام حضرت آدم کو روئے زمین پر خلافت و تیا بت الہیہ کی روحانی و سحر آتی تعلیم دے

تاویل یہ ہے کہ چھ پیغمبروں (جن کا اوپر ذکر ہوا) کی شریعتیں اور ان کی تاویلات آنے کے بعد یعنی چھ ادوار میں دنیا نے انسانیت اور عالم دین مکمل ہوا، اور حضرت قائم الزمان علیہ افضل الصلوٰۃ والسلام کے دور میں اللہ تعالیٰ اپنے اس کام سے فارغ ہو کر عرش پر متمکن ہوا، عرش پر اللہ کے متمکن ہونے کا مطلب ہے منظر الہی سے مکمل طور پر نور کا ظہور ہونا۔

جب یہ معلوم ہوا کہ بڑے دور کے چھ ناطق اللہ تعالیٰ کے وہ چھ دن ہیں، جن میں اُس نے عالم دین کو پیدا کیا، اور حضرت قائم اللہ کے وہ ساتویں دن (سینچر) ہیں، جن میں وہ سب کچھ مکمل کر کے دین کے زندہ عرش پر متمکن ہوا ہے، تو پھر یہ بھی جاننا چاہئے کہ ہر ناطق کے دور میں سات آئمہ ہونے کا جو اصول مقرر ہے اس میں بھی یہی حکمت ہے کہ چھ امام خدا کے چھ دن ہیں، اور ساتواں امام خدا کے ساتویں دن (سینچر) ہیں، چنانچہ ہر ناطق کے انفرادی عالم دین کی تخلیق و تکمیل کے لئے بھی سات اماموں کا ہونا ضروری ہے۔

نمونہ قیامت:

یہاں پر قرآن پاک سے ایک ایسی دلیل پیش کی جاتی ہے کہ جس سے یہ حقیقت بالکل صاف روشن ہو کہ ان بڑے پیغمبروں کے دینی عالم دو قسم کے ہیں:-

۱۔ اجتماعی

۲۔ انفرادی

چنانچہ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ کی آخری عمر میں یوں ارشاد فرماتا ہے کہ
 وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَى يَوْمِ الْبَيْعَةِ
 اور جن لوگوں نے تمہاری پیروی کی ان کو قیامت تک کافروں پر غالب رکھوں
 گا۔ (۳۵)

اس ارشاد الہی کی حکمت یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کے تابعین اللہ تعالیٰ
 کے مذکورہ وعدہ کے مطابق اپنے مخالفین پر دینی لحاظ سے (یعنی دلیل و
 حجت کے اعتبار سے) غالب و فاتح رہے، تاآنکہ دورِ عیسیٰ کے چھ اماموں
 کا زمانہ گزر گیا، اور جب دورِ عیسیٰ کے ساتویں امام کا ظہور ہوا تو اُس وقت
 نصرائیت کی قیامت برپا ہوئی، کیونکہ پیغمبرِ اسلام ایک نئی کتاب اور تازہ شریعت
 لے کر دنیا میں تشریف فرما ہوئے، اب حضرت عیسیٰ کے دین کے متعلق اللہ تعالیٰ
 نے جو کچھ وعدہ فرمایا تھا، وہ پورا ہو چکا، اگر ہم اس آیہ مبارکہ کے ایسے ہی معنی
 نہ لیں، بلکہ یوں کہیں کہ دینائے عیسائیت میں ابھی تک کوئی قیامت واقع نہیں
 ہوئی ہے، تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اگر نصاریٰ ظہورِ اسلام کے بعد مسلمان
 نہ بنیں، تو ان پر کوئی جرم نہیں، اور جو غیر عیسائی اسلام کو قبول کریں، تو وہ
 پھر بھی مسلمان نہیں ہو سکے، کیونکہ بموجب وعدہ الہی عیسائیوں کو قیامت تک
 اپنے مخالفین پر غالب و فاتح ہونے کا حق حاصل ہے، تو کیا کوئی دانشمند مسلمان
 اس بات کو قبول کرے گا؟ نہیں نہیں، ہرگز نہیں۔

جاننا چاہئے کہ مذکورہ دلیل سے نہ صرف یہی حقیقت واضح و روشن ہوئی،
 کہ ہر ناطق پیغمبر کی دینائے شریعت میں ساتویں امام کے آنے پر قیامت برپا ہو

جاتی ہے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ یہ اصول بھی معلوم ہوا کہ قیامت خواہ چھوٹی ہو یا بڑی، اختیاری ہو یا اضطراری، انفرادی ہو یا اجتماعی، جب بھی آجائے تو وہ غیر شعوری طور پر آتی ہے، چینتی چلاتی ہوئی نہیں آتی۔

بات دراصل اس بارے میں تھی، کہ پیغمبر اور امام علیہما السلام حد و دین کی سرپرستی کس طرح فرماتے ہیں، اور اسماعیلی دعوت و ہدایت کا نظام کس طرح قائم ہے، اور یہ کہنا تھا کہ اسماعیلی نظام دعوت کس عظیم الشان طریقے سے پورے دور کے ظاہر و باطن پر محیط و حاوی ہے، اور امام برحق کی ہمہ رس معجزانہ ہدایت کس قدر میرت انگیز ہے، کہ دنیا کے بارہ ہزیروں میں سے ہر ایک میں ایک ظاہر حجت اور ایک باطن حجت کے تحت تیس داعی ہو کر تے ہیں۔

ایک مثال :-

یہ بات سب جانتے ہیں کہ، سمندر کا پانی اس گڑھ ارض کے آباد اور غیر آباد دونوں حصوں کی ضرورت سے بھی بہت زیادہ ہے، مگر دنیا بھر کے پہاڑوں، جنگلوں، صحراؤں، باغوں اور کھیتوں کو پانی پہنچانے کا دار و مدار سورج پر ہے، کیونکہ سورج ہی ہے جو سطح سمندر کے پانی کو بخارات کی صورت دے کر فضا میں بلند کرتا ہے، پھر انہیں بادلوں کی شکل میں تبدیل کر کے تیز ہواؤں کے کنہوں پر مختلف اطراف میں بھیج دیتا ہے، ان بادلوں سے برف و بارش برساتا ہے اور برف و یخ کے بے پناہ ذخیروں سے ندیاں،

نالے، اور دریا جاری کر دیتا ہے، یہی چشمہ نور و حرارت ہے، جو سال بھر کے موسموں پر کٹر طول رکھتا ہے، نباتات اگاتا ہے، اور انہیں نشوونما دیتا ہے ہر قسم کی فصل اور پھل اسی سورج کی روشنی اور گرمی کی بدولت پک کر تیار ہو جاتے ہیں، اور تمام ذی حیات مخلوقات اسی نور کے طفیل سے زندہ اور قائم ہیں۔ الغرض اگر یہ نور نہ ہوتا تو کچھ بھی پیدا نہ ہوتا، پس یہی مثال امام عالی مقام کے علم اور نور کی بھی ہے، کہ امام کا علم عالم دین کا سمندر ہے، اور آپ کا نور دُنیا سے رونائیت کا سورج ہے اور یہ امام علیہ السلام کے علم کا صاف و شفاف پانی حد و دین کی نہروں کے توسط سے آیا کرتا ہے۔

آفاق و انفس کی آیات:

جب صاحب امر کی بے مثال ہدایت و رہنمائی سے مومن میں دین شناسی اور امام شناسی کی آنکھ پیدا ہو جاتی ہے تو وہ آفاق و انفس کی آیات اور کائنات و حیات کے معجزات کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے، پھر اُسے امامِ حجتی و حاضر کی ظاہری و باطنی ہدایت کی اہمیت اور نقوسِ خلافت میں اس کی واقعیت کے بارے میں یقین کامل حاصل ہوتا ہے۔

امام دُنیا میں، ہمیشہ کے لئے حاضر ہیں:

مثال کے طور پر بتایا جاتا ہے، کہ اس آفاق (کائنات) میں آسمان، سورج، چاند، ستارے، کہکشاں، بجلی، رعد، دن، رات، آگ، ہوا، پانی، مٹی، پہاڑ،

نباتات، حیوانات اور انسان کے علاوہ دوسری بہت سی چیزیں اس طرح سے ہیں، کہ وہ جب سے پیدا کی گئی ہیں، تب سے حاضر اور موجود ہیں، اور ان میں سے کسی ایک چیز کا ختم ہو جانا یا غائب ہو جانا قطعی ناممکن ہے، خواہ وہ کتنی چھوٹی اور کس قدر معمولی کیوں نہ ہو، پھر جیسے سورج کا غائب ہو جانا، کیونکہ خدائے احکم الحاکمین نے دین اور اس مادی عالم کے اندر جو کچھ بھی پیدا کیا ہے اس کی ایک خاص ضرورت تھی، اسی لئے پیدا کیا ہے، اب بھی اس کی ضرورت ہے، اور آئندہ بھی اس کی ضرورت رہے گی۔ پس اگر یہ کہا جائے، کہ اس دور میں عالم دین کا سورج لوگوں سے غائب ہو چکا ہے، تو یہ امر محالات میں سے ہوگا۔

دینی علم اور کتابوں کی اہمیت:

القرض اس دور میں دینی علم کی طرف توجہ دینا از حد ضروری ہے، خصوصاً نئی نسل کے لئے تو اس کے بغیر ایمانی رُوح اور مذہبی زندگی کی کوئی توقع ہی نہیں، لہذا جنرل قسم کے دینی کتب کے علاوہ مذہبی نصاب کی کتابیں انتہائی ضروری اور لازمی ہیں، ان دونوں قسم کی کتابوں کے بغیر ہر وہ منصوبہ، جو مذہبی ترقی اور رُوحانی تعلیم کے لئے بنایا جاتا ہے، نا تمام بلکہ ناکام ہے۔

اسی سلسلے میں بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اُردو جیسی قومی زبان میں جو ہمارے عزیز وطن پاکستان اور ہماری خداداد مملکت کی زبان ہے، چند کتابوں کے سوا کچھ نہیں، حالانکہ اس ملک میں لاکھوں کی تعداد میں ایسے

اسماعیلی بستے ہیں کہ ان کا تعلق مختلف علاقوں اور جُدا جُدا زبانوں سے ہے، جیسے گجراتی، سندھی، پنجابی، بلوچی، پشتو، چترالی، شینا (گلگت) برہوشسکی اور وخی، مگر ان علاقائی زبانوں اور مقامی بولیوں میں سے کوئی بھی ایسی نہیں جو ان بے شمار اسماعیلی افراد کی دینی وحدت کے سلسلے میں کوئی خاص مدد کر سکے، نہ وہ ان کی مشترکہ زبان کا کردار ادا کر سکتی ہے، اور نہ ہی پاکستان کے کروڑوں مسلمان بھائیوں کو ان کی اپنی خواہش پر اسماعیلیت کا تعارف کر سکتی ہے، سوائے موجودہ قومی اور سرکاری زبان کے جو اردو ہے۔

یہ حقیقت تو مسلمہ ہی ہے، کہ عربی (جو دنیا بھر کے مسلمانوں کی دینی لسان ہے) اور فارسی میں اسماعیلی اماموں اور بزرگوں کے ایسے ایسے علمی و ادبی شاہکار موجود ہیں کہ جنکی عالمگیر شہرت اور بے پایاں معنویت کی بالادستی کے سامنے زمانہ قدیم و جدید کے نامور حکماء اور فلسفیوں نے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں، اور ایسی ہی اہم کتابوں میں سے بعض کے انگریزی، فرانسیسی، جرمنی وغیرہ زبانوں میں ترجمے بھی ہو چکے ہیں۔ دوسری طرف سے دنیا ٹے علم و ادب کے بڑے بڑے اداروں میں اسماعیلی مذہب کی مشہور و معروف شخصیتوں پر ریسرچ (تحقیق) کا کام ہو رہا ہے، جس کے نتیجے میں اسماعیلیت سے متعلق کتابیں چھپ کر شائع ہو رہی ہیں، لیکن تعجب اور حیرت کا مقام ہے کہ اردو میں اب تک جو کچھ ترجمہ و تخلیق کا کام ہونا ضروری تھا اس کا عشرِ عشر (دسواں حصہ) بھی نہیں ہوا ہے۔

کتابِ اِذَا:

کتابِ زیرِ نظر اور دوسری چند تصنیفات و ترجمے مذکورہ بالا مقصد کے حصول کے سلسلے میں اس بندہ عاجز و ناتوان کی ایک ناچیز سعی و کوشش ہے، آپ کو شاید معلوم ہو کہ کچھ عرصہ قبل میرے بعض مقالے اسماعیلیہ ایسوسی ایشن برائے پاکستان کہ اچی کی وساطت سے شائع ہوئے تھے، یہ کتاب ان مقالات میں سے چند کو لے کر مرتب کی گئی ہے، سوائے چند کے باقی سب مضامین شائع تو ہو چکے تھے، تاہم مصلحت یہ قرار پائی کہ یہ مقالات جو مختلف ضروری موضوعات سے متعلق ہیں، کتاب کی صورت میں یکجا اور مستقل طور پر شائع کئے جائیں۔

علم و عمل کے دو مرحلے:

اسماعیلی نظریات کے لحاظ سے علم و عمل کے دو مرحلے ہیں، چنانچہ مرحلہ اول پر تنزیلی و شریعت کے احکام سامنے آتے ہیں، اور مرحلہ دوم پر تاویل اور حقیقت کے امور سے واسطہ پڑتا ہے، یا دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہئے کہ آنحضرتؐ کی نبوت و رسالت کے آغاز سے لے کر قیامتِ کبریٰ تک جو دور گزرنے والا ہے اس کے دو حصے کئے گئے ہیں: پہلے حصے کا زیادہ تر تعلق تنزیلی و شریعت سے ہے، اور دوسرے حصے کا واسطہ تاویل و حقیقت سے، تاکہ دور کے دونوں حصوں کے جملہ مومنین اپنے اپنے وقت کے

مطابق اللہ تعالیٰ، رسولؐ اور اولی الامر کی علمی و عملی اطاعت کو جیسا کہ چاہئے
بجالا سکیں۔

شکر یہ:

اب میں بالآخر ان تمام عزیز روحانی بھائیوں، بہنوں، دوستوں اور تلامذہ
کا دل و جان اور صدق و ایقان سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ وہ ہر بار مختلف سورتوں
میں علم کی قدر دانی اور علمی خادم کی ہمت افزائی کرتے ہوئے آئے ہیں، اور دینی
علم کے پھیلانے کے سلسلے میں جو کچھ بھی ضروری خدمات انجام دیتے ہیں، ان سے
ان کا مقصد اعلیٰ صرف یہی ہے کہ انہیں امام عالمیت کی خوشنودی حاصل ہو۔

میرا اعتقاد اور ایمان ہمیشہ مجھ سے یہ تقاضا کرتا رہا ہے کہ بموجب حدیث
شریفہ **الْحُبُّ بَيْنِي وَالْبُغْضُ بَيْنِي**۔ "حقیقی مومنوں کی اخوت و دوستی سے مجھے
جو روحانی مسرت و شادمانی حاصل ہوتی ہے، میں اس کی قدر دانی کے طور پر کچھ
تذکرہ کروں، عربی کا ایک مشہور قول ہے: "ذکر العیش نصف العیش"
یعنی خوشی و راحت کا تذکرہ اس کے نصف کے برابر لذت بخش ہوتا ہے، اس
سے یہاں میری مراد روحانی خوشی اور دینی راحت ہے، اور میں صرف اسی کا
تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔

پھر ایک بار ان تمام تعلیم یافتہ اسماعیلیوں، ترقی پسند بھائیوں،
اور عزیز تلامذہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں جو اپنے ہر علمی خادم کی خدمت کو قد کی
نگاہ سے دیکھا کرتے ہیں، اور دینی تعلیمات کو فروغ دینے کے سلسلے میں جو کچھ

بھی ہو سکے تو تعاون کر لیا کرتے ہیں، اور وہ چاہتے ہیں کہ امام شناسی کی تعلیمات کی روشنی سے دیناٹے اسماعیلیت کا کوئی گوشہ خالی نہ رہے۔

میں اسی ضمن میں اپنے عزیز و محترم دینی دوست جناب ممتاز علی صاحب (بی کام) ابن صدر الدین محمد جعفر کا بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے ازراہ کرم کراچی جیسے گنجان شہر میں میری رہائش کے لئے بہترین بندوبست اور اعلیٰ انتظام کر دیا، خداوند تبارک و تعالیٰ جملہ نیکو کار اور خدمت گزار مومنین پر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے نظر رحمت اور سایہ عاطفت رکھے! آمین یا رب العالمین !!

فقط آپ کا ایک دینی خادم

نصیر الدین نصیر ہونزائی

ہو قع عید میلاد النبیؐ بروز جمعرات

کراچی

۱۲۔ ربیع الاول ۱۳۹۲ھ / ۲۴۔ اپریل ۱۹۷۲ء

Spiritual Science
and
Luminous Science

Knowledge for a united humanity

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ذکرِ الہی میں شفا

ذکرِ الہی نتیجتاً صحت و سلامتی کا ذریعہ، اطمینانِ قلب کا باعث اور علم و حکمت کی کلید ہونے کے علاوہ لفظی طور پر بھی خدا شناسی و معرفت کی ایک روشن دلیل ہے۔

لفظِ ذکر کے اشارے:

لفظِ ذکر کے معنی میں خدا کی شناخت اور پہچان کے اشارات اس طرح سے ہیں کہ ذکر کے معنی ہیں کسی جاتی پہچانی ہوئی چیز کے تصور کہ شکل و صورت، اور الفاظ و معنی کے ذریعہ دل و دماغ میں لانا، مگر کسی چیز کو دیکھے، جانے اور پہچانے بغیر یاد کہ نامحال ہے، اب اس بیان سے صاف طور پر یہ نتیجہ نکلا کہ خدا کی حقیقی یاد وہ ہے جو معرفت (یعنی پہچان) کی روشنی میں کی جاتی ہے۔

ذکرِ الہی کی مثال:

حقیقی ذکر کی ایک خاص شرط خدا شناسی اور معرفت ہونے کی دلیل یہ ہے

جو خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "فَادْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اَبَاءَكُمْ اَوْ اَشْدَّ ذِكْرًا" (یہ) پس تم اللہ تعالیٰ کو اس طرح یاد کرو جس طرح تم اپنے آباء کو یاد کرتے ہو، یا اس سے بھی زیادہ یاد کرو۔" اس ارشادِ الہی کا مطلب یہ ہے کہ لوگ اپنے آباء کو دیکھے، پہچانے اور مانوس ہوئے بغیر اس کثرت و شدت سے یاد نہیں کر سکتے، جس کو اللہ تعالیٰ اپنے ذکر کی مثال اور نمونہ قرار دے، اور اگر وہ چار و ناچار اپنے آباء کو یاد کرنے میں کوئی معیاری نمونہ پیش کرتے ہیں، تو اس کی وجہ پہچان، مانوسیت اور محبت ہے، چنانچہ اس مثال سے یہ امر لازمی ہوا کہ خدا کو معرفت اور عشق سے یاد کیا جائے۔

ذکرِ الہی کی اس مثال میں ان تمام حقائق کے اشارے سموئے ہوئے موجود ہیں، کہ ایک صاف دل اور خیر خواہ باپ اپنے چھوٹے سے بچے کو کس قدر عزیز رکھتا ہے، اس کے حق میں کتنا شفیق و مہربان ہوتا ہے، اور کس طرح اس کی بہتری و کامیابی کا طلب گار رہتا ہے، اور اس کا وہ چھوٹا سا معصوم اور سادہ لوح بچہ۔ جب اپنے پیارے باپ سے دُور رہنے لگتا ہے تو کس قدر بے تاب و مضطرب ہو کر اور کیسے اشتیاق کے عالم میں باپ کو یاد کرتا رہتا ہے، ہر چند کہ اس کی ماں، بہنیں، اور گھر کے دوسرے عزیز افراد سے بہلا چھسلا کر باپ کی یاد سے باز رکھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، مگر یہ اپنے باپ کو اور اس کی شفقتوں اور نوازشوں کو ہرگز فراموش نہیں کر سکتا، اور جب کوئی شخص بھول سے اس کے باپ کا کوئی تذکرہ کرتا ہے، تو اس کے نازک اور پاکیزہ دل میں باپ کی محبت کی آگ شعلہ زن ہونے لگتی ہے، اور وہ بہانہ جوئی کرتے ہوئے روتے

لگتا ہے، محبت اس کے اشتہا کو اپنے قبضے میں کر لیتی ہے، اس لئے وہ کچھ کھاپتی نہیں سکتا جب بہت سی کوشش کے بعد اس کو سلا دیا جاتا ہے تو وقفہ وقفہ پر جھٹکوں کے ساتھ چونک اٹھتا ہے، کیونکہ ہر بار وہ خواب و خیال میں اپنے باپ ہی کو دیکھتا ہے، اور اس کے ساتھ چمٹ جانے کی کوشش میں ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے جاگ اٹھتا ہے، یہاں تک کہ بعض دفعہ شدتِ یاد کے بخار سے اس کا جسم پتار ہوتا ہے۔

خدا کی یاد اور باپ کی یاد میں فرق:

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ معصوم اور سادہ لوح بچہ مانوسیت کے بعد جب باپ سے جدا اور دُور رہنے لگتا ہے تو وہ بعض دفعہ شدتِ اشتیاق کی بیماری میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے، لیکن ذکرِ الہی کے بارے میں عقل و دانش یہ کہتی ہے، کہ اگرچہ خدا کی یاد کی مثال باپ کی یاد سے دی جاسکتی ہے، تاہم انسانی یاد کے آثار و نتائج کے برعکس ذکرِ الہی سے حقیقی مومنین کے لئے جسم و جان کی صحت و سلامتی اور سکون و اطمینان حاصل ہونا چاہئے، اور قرآنی ارشادات کا اشارہ بھی یہی ہے، چنانچہ قولِ قرآن ہے کہ:

أَلَا يَذَكِّرُنَا اللَّهُ نَوْمًا مِنَ الْقُلُوبِ ۚ ۱۳۸

خوب سمجھ لو کہ اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان ہو جاتا ہے۔

پس مطلب صاف طور پر ظاہر ہے کہ کسی انسان کے دل کو اطمینان اُس وقت ہو جاتا ہے جب کہ وہ ذہنی اور جسمانی تکلیفوں اور بیماریوں سے بالکل

محفوظ ہو، یا پھر اس کو برداشت کی معجزانہ قوت ملے، اس کے بغیر اطمینانِ قلب کے کچھ معنی نہیں۔

ذکر کا تعلق پاک دل اور پاک زبان سے:

جب تک انسان اپنی زبان اور دل کو ناشائستہ اقوال و افعال کے زنگ و کدورت سے پاک نہ رکھے تو وہ مذکورہ بالا مثال کے مطابق خدا کو یاد نہیں کر سکتا، اور جب حقیقی محنتوں میں خدا کو یاد نہیں کر سکتا تو ذکرِ الہی کے ظاہری و باطنی فوائد سے محروم رہ جاتا ہے، اور اس محرومیت میں ہر قسم کی ناکامی پوشیدہ ہے۔

ذکر میں شفا ہونے کی دلیل:

اگر پوچھا جائے کہ یادِ الہی کس طرح باعثِ شفا ہو سکتی ہے؟ تو اسکا جواب یہ ہے کہ اکثر دفعہ انسان اپنی غلط کاریوں کی وجہ سے کسی بیماری تکلیف میں مبتلا ہو جاتا ہے، غلط کاری نفسِ امارہ کے حکمران ہونے سے صادر ہوتی ہے، نفسِ امارہ کی حکمرانی نہیں ہو سکتی، جب تک کہ عقل اور رُوح الایمان کمزور نہ ہوں، یہ دونوں کمزور اسوقت ہوتی ہیں، جب کہ ان کو اصلی اور پر قوت غذا نہ ملے، اور ایسی غذا کا واحد ذریعہ ذکرِ الہی ہے، جس میں عقل اور رُوح الایمان کے لئے سب کچھ موجود ہے، پس معلوم ہوا کہ جب اللہ کے بندوں کو ذکر سے عقل اور رُوح کی لذتیں اور راحتیں میسر ہونے لگتی ہیں، تو اس وقت ان کی نفسانی خواہشات روحانی قوتوں کے نیچے دبی ہوئی رہتی ہیں، پھر

اس وقت ایسی بیماریاں اور تکالیف نہیں آتیں، جو غلط کاریوں کی پاداش کے طور پر پہنچتی ہیں۔

ذکر میں جسمانی مدد:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئْتًا فَانصَبُوا وَادْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿۸۷﴾ اے ایمان والو! جب تم (جہاد میں) کسی گروہ کے مقابل ہوتے ہو، تو ثابت قدم رہو، اور اللہ تعالیٰ کو بہت یاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو، پس ظاہر ہے کہ ذکر الہی سے نہ صرف عقل و روح ہی کو نورانی قوت ملتی ہے، بلکہ اس سے جسم کو بھی معجزانہ قسم کی مدد ملتی رہتی ہے۔

مادی خوف

ذکر الہی اور خوفِ خدا کے ذریعہ بیماریوں سے شفا یابی کی ایک اور مثال یہ ہے کہ جب انسان پر یکایک ظاہری قسم کا کوئی خوف طاری ہو جاتا ہے تو اُس وقت اس کے دل کے مرکز سے عجیب قسم کی ہیمانی لہر اس کے تمام جسم میں پھیل جاتی ہے، نہ معلوم کہ کچھ لوگوں کے علم میں یہ بات کس طرح آگئی کہ خوف کی ایسی کیفیت کے دوران روحِ حیوانی کے ذراتِ خون کی نالیوں وغیرہ میں دوڑنے لگتے ہیں، چنانچہ انہوں نے بعض بیماریوں کا نفسیاتی علاج خوف کے اصول سے شروع کر دیا، مثلاً بنجار کے مریض کے پاس جیکہ اسے خبر نہ ہو، بندوق چلائی،

اور یہ طریقہ بعض دفعہ باعثِ شفا ثابت ہوا کہ خوف کے ایک ہی جھٹکے کے ساتھ اس کی بیماری کے سارے جراثیم نکل گئے، اور وہ صحت یاب ہو گیا، اس کا سبب شاید یہی ہو، کہ رُوحِ حیوانی کا کچھ حصہ مدافعہ کے لئے یا گریز کی صورت میں جسم سے خارج ہو جاتا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ بیماری کے اکثر جراثیم بھی نکل جاتے ہیں۔

روحانی خوف:

مثالِ مذکورہ بالا ظاہری اور مادی خوف کی تھی، اب اس عجیب و غریب اور معجزانہ خوف کا حال سنئے، جو کثرتِ ذکر کے بعد حق پرست بندوں پر طاری ہو جاتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ:

اللَّهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِي تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِينُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ (۲۱۳)

اللہ تعالیٰ نے بڑا عمدہ کلام نازل فرمایا ہے، جو ایسی کتاب ہے کہ باہم ملتی جلتی ہے، بار بار دہرائی گئی ہے، جس سے ان لوگوں کے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں، بدن کانپ اٹھتے ہیں، پھر ان کے بدن اور دل نرم ہو کر اللہ کے ذکر کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔

آیہ مذکورہ بالا اگرچہ ظاہراً قرآنِ پاک کی تعریف میں ہے تاہم اس میں حکمت کا پہلو بھی بجائے خود موجود ہے، وہ یہ ہے کہ ہر مومن کے لئے عبادت و بندگی کے وہ الفاظ، وظائف، اوراد اور اسماء "احسن الحدیث" کی

حیثیت سے ہیں جو امام زمان علیہ السلام مقرر فرماتے ہیں، اور یہی خاص عبادت و ذکر وہ عظیم معجزہ ہے جو کئی طرح کے معنوں سے دہرائی جانیوالی کتاب کی صورت اختیار کرتا ہے، اور اسی سے مومنین کے بدن کانپ اُٹھتے ہیں، پھر ان کے بدن اور دل نرم ہو کر ذکر کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں، پس اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جن طرح انسان کا دل ذکر الہی کے فیضان کو قبول کر سکتا ہے، اسی طرح اس کا جسم بھی یاد الہی کے فیوض و برکات سے بہرہ ور ہو سکتا ہے، چنانچہ باور کیا جاسکتا ہے کہ اس قسم کے ذکر کے معجزے سے انسانی جسم کے خلیات و ذرات کی تجدید ہو جاتی ہے، جس سے بہت سی روحانی و جسمانی بیماریوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

علاج و معالجہ کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے ماہرین کا مجموعی عمل یہ ہوتا ہے کہ کسی تدمیر سے جراثیم کو مرض کے اندر ہی ہلاک کر دیا جائے یا انکو بدر کر دیا جائے اب اگر جراثیم میں زندگی پائی جاتی ہے، اور ان میں ایک قسم کی رُوح موجود ہے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جراثیم رُوح اور جسم دونوں میں مشترک ہے یعنی روحانی اور جسمانی دونوں طریقوں سے اس پر تصرف کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ پروردگار عالم کا قول ہے کہ:

مَا مِنْ دَابَّةٍ اِلَّا هُوَ اَخَذَ بِنَاصِيَتِهَا اِنَّ رَبِّي عَلِيٌّ حَرِيظٌ
 مُسْتَقِيمٌ ۝۵۶ زمین پر چلنے والا کوئی بھی ایسا نہیں، مگر یہ کہ (خدا) اس کی پیشانی کے بال پکڑنے والا، یقیناً میرا پروردگار سیدھی راہ پر ہے پس اس آیت کی حکمت کے بموجب یہ ضروری نہیں کہ ہر جاندار مخلوق کی پیشانی کے بال

ہوں، مگر یہ ضرور ہے کہ، ہر ذی رُوح مخلوق میں اپنی نوعیت کا احساس ہے اور قادرِ مطلق ہر جانور کے اسی احساس کو پکڑ کر راہِ راست کی طرف پہنچ سکتا ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر قسم کا جو ثور بھی اپنی نوعیت کا احساس رکھتا ہے پس اگر خدا چاہے تو اس کے احساس پر تصرف کر سکتا ہے، اور اس میں خوف و گریز کی خواہش ڈال سکتا ہے۔

ذکر میں قوت برداشت:

ذکرِ الہی کے استقدر شفا بخش اور معجز نما ہونے کے باوجود بھی اگر کوئی مومن خدا کی مصلحت و حکمت سے بیمار رہتا ہو، تو پھر بھی خدا کی یاد سے یا اُوسی کی کوئی علامت ظاہر نہیں ہو سکتی، کیونکہ ایسے موقع پر عبادت اور ذکرِ مومن کو صبر و تحمل اور تسلیم و رضا کی ایسی بے مثال طاقت بخشتا ہے کہ جس سے وہ اپنی بیماری کی تکلیف کو محسوس ہی نہیں کرتا، جیسا کہ انبیاء، اولیاء اور حقیقی مومنین کے تذکروں سے یہ مثال ظاہر ہے۔

ذکر کا سب سے بڑا مقصد:

حقیقی مومن اپنے پروردگار کو صرف اس لئے یاد نہیں کرتا، کہ اس کے جسم کی صحت و سلامتی قائم رہے اور بس، بلکہ اس کا سب سے بڑا مقصد خدا کی خوشنودی حاصل کرنا ہے، جس میں مومن کے لئے سعادتِ دارین کے راز سہرا بستہ ہیں۔ تاہم یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ خدا کی خوشنودی کے طلب گار رہنے سے تمام روحانی و جسمانی فیوض و برکات حاصل ہوتی ہیں، تاکہ مومن شکر گزاری کے طریق پر بھی خدا کو زیادہ سے زیادہ یاد کرتا رہے۔

نعتِ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

(۱) کلامِ خداوان کلامِ محمد ﷺ

سخنِ گفتہ یزدان ز کامِ محمد ﷺ

ترجمہ: حضرت محمد ﷺ کے کلام کو اللہ تعالیٰ کا کلام سمجھ لینا (کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کی زبان مبارک سے خطاب فرمایا ہے۔)

(۲) کتابِ خدا معجز بے مثالی

گواہِ کمال کلامِ محمد ﷺ

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کی کتاب (یعنی قرآن) جو ایک بے نظیر معجزہ ہے، حضرت محمد ﷺ کے کلام کی کمالیت کی گواہ ہے۔

خداوندیہ تہ نوازش نمود

بتکریم کو لاک بکامِ محمد ﷺ

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کے حصول مقصد کے لئے کو لاک (لَمَّا خَلَقْتَ الْاَفْلَاقَ) کی تعظیم و تکریم سے نوازش فرمائی۔

خدایش نشانیں بر عرشِ عزت
مقایستِ محمود مقامِ محمدؐ (۳)

ترجمہ: حق تعالیٰ نے آنحضرتؐ کو (بموقعِ معراج) تختِ عزت یعنی عرشِ اعظم پر بٹھایا
(ہیں) محمد کا مقام وہ مقام ہے جس کی تعریف کی گئی ہے۔

گمراہے حق او صیادِ رسل (۵)

خدا سفتہ اندر نظامِ محمدؐ

ترجمہ: حق تبارک و تعالیٰ نے حضراتِ انبیاء و آئمہ علیہم السلام کے ربانی موتیوں کو
حضرت محمدؐ کی لڑی (سلسلہ) میں پروئے ہیں۔

برون از حساب و فنون از شمار (۶)

درودِ الہی بنامِ محمدؐ

ترجمہ: حضرت محمدؐ صلعم کے اسمِ گرامی پر اللہ تعالیٰ کی بے حساب اور لاتعداد رحمت
نازل ہو۔

در آمد بدینِ خدا عالمے

با حکامِ شرع و حُسامِ محمدؐ (۷)

ترجمہ: حضرت محمدؐ کے احکامِ شرعی اور قیامِ تلوار سے (جو حضرت علیؑ کے ہاتھ میں تھی)
دینِ خدا میں ایک پوری دنیا داخل ہو گئی۔

(۸) کشف بوئے رحمن رسوی میں

غذائی جلالی مشام محمد

ترجمہ: حضرت محمدؐ کا شامہ (یعنی سونگھنے کی قوت) میں کی جانب سے جلالی غذا کے طور پر
رحمن کی خوشبو میں سونگھ لیا کرتا ہے۔

(۹) کسی راکہ بختش کتد یار مندی

فتد از عقیدت بگام محمد

ترجمہ: جس شخص کو اپنا بخت مدد کرتا ہے، وہ خلوص و عقیدت سے حضرت محمدؐ
کے مبارک قدموں پر جاگرتا ہے۔

(۱۰) نبی و علی ہست مولائے حاضر

بؤد در دو عالم دوام محمد

ترجمہ: مولائے حاضر حضرت نبیؐ اور حضرت علیؑ (کائنات) ہیں، کیونکہ دونوں عالم میں حضرت
محمدؐ کی دائمیت برقرار ہے۔

پیام محمد پیام امامت

(۱۱) پیام امامت پیام محمد

ترجمہ: حضرت محمدؐ کا پیغام نور امامت کا پیغام ہے، نور امامت کا پیغام حضرت محمدؐ
کا پیغام ہے۔

کنون شہ کہیم آلِ پاک نبی دان

برو می کتم احترام محمدؐ (۱۲)

ترجمہ: موجودہ وقت میں مولانا شاہ کہیمؒ (حاضر امام) کو حضرت نبیؐ کی پاک اولاد سمجھنے میں تو انہی کے واسطے سے حضرت محمدؐ کا احترام بجالاتا ہوں۔

شدہ کشفِ اسرارِ حق برو لم

چو شد جان من مست جام محمدؐ (۱۳)

ترجمہ: جب سے میری جان (روح) حضرت محمدؐ صلعم کے (عشق کے) پیالے سے مست و مخمور ہوئی، تو میرے دل پر حق تعالیٰ کے اسرار منکشف ہوئے۔

فدایِ امای کہ از آلِ اوست

تن و جان زارِ غلام محمدؐ (۱۴)

ترجمہ: حضرت محمدؐ کے اس غلام کا جسم و جان اس امام پر فدا ہو جو آنحضرتؐ کی آل سے ہیں۔

چہ خوش خواند نورش بگوشِ نصیر

کلامِ خدایم کلام محمدؐ (۱۵)

ترجمہ: (سبحان اللہ) اُس (امام زمانؑ) کے نور نے نصیر کے کان میں خدا کے کلام (یعنی حکمت قرآن) کو نیز آنحضرتؐ کے کلام (یعنی حکمت حدیث) کو کس خوش اسلوبی سے پڑھا۔

سردارِ رُسل کے وزیر

وزیر کے لغوی معنی ہیں بوجہ اٹھانے والا اور اصطلاح میں وزیر اُس شخص کو کہتے ہیں جو کسی بادشاہِ مطلق العنان یا صدرِ جمہور کے امورِ مملکت اور نظامِ حکومت کی ذمہ داریوں کے بارِ گران کا متحمل ہوتا ہے، یہی مثال اور مفہوم خلافتِ الہیہ یعنی دینی حکومت کا بھی ہے، کہ اس میں ہر دور کا پیغمبر دینی بادشاہ اور اس کا وصی (یعنی وہ امام جس کو پیغمبر وصیت کر کے اپنا جانشین مقرر کرے) دینی وزیر ہوا کرتا ہے۔

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب پہلی بار کوہِ طور پر اللہ تبارک و تعالیٰ سے ہمکلام ہوئے تو حق تعالیٰ نے ان کو پیغمبری کے درجہ پر مامور فرمایا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس موقع پر پروردگارِ عالم سے جو کچھ عرض و التجا کی، اس میں یہ بھی ہے کہ: **وَاجْعَلْ لِي وَرَثَةً مِّنْ اَهْلِيْ هٰرُونَ اَخِيْ اَسَدُودٍ** یہ اُزری و امشرکہ فی اہسری ۲۹-۳۰ اور میرے لئے میرے اہل میں سے ایک وزیر بنادے (یعنی) میرا بھائی ہارون، اس کے ذریعے سے میری کمر مضبوط کر دے، اور اسے میرے کام میں میرا شریک کر دے۔

اسماعیلی اور اثنا عشری کتابوں کے علاوہ سنی مکتبہ فکر کے ماخذ (SOURCE)

(Books) میں بھی یہ روایت مذکور ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سلسلہ قصہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی، تو آنحضرتؐ نے بارگاہِ خداوندی میں عرض کی کہ: اے بارِ خدا! میں بھی اسی طرح التجا کرتا ہوں جس طرح موسیٰ نے التجا کی تھی: **وَاجْعَلْ لِي وَزِيرًا مِّنْ اَهْلِيْ اَنْحِ اَشَدُّ دَيْهًا اَزِّيْ وَاَشْرِكُهُ فِيْ اَمْرِيْ** ۲۹-۳۰ اور میرے اہل میں سے ایک وزیر بنا دے (یعنی) میرا بھائی (علیؑ)، اور اس کے ذریعہ سے میری مکر مضبوط کرے، اور اسے میرے کام میں شریک کر دے۔

حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے یہ روایت منقول ہے، آپ فرماتے ہیں کہ، جب آیت کریمہ: **وَاجْعَلْ لِيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ** اور آپ اپنے نزدیک ترین کنبہ والوں کو ڈرا لے، نازل ہوئی تو آنحضرتؐ صلعم نے ایک پیالہ دودھ اور بکری کی ایک ران دسترخوان پر رکھ کر خاندان بنی عبدالمطلب کو مدعو کیا، جو چالیس مردوں پر مشتمل تھا، مگر دس نوجوان تو ایسے تھے کہ ان میں سے ہر فرد ایک بکری اکیلا ہی کھا سکتا تھا، اور ایک مشک دودھ پی سکتا تھا، پھر بھی ان لوگوں نے پیٹ بھر کر کھایا پیلا۔ اس روز ابو الہب بھی ان کے ساتھ تھا۔

جب خورد و نوش سے فارغ ہو چکے تو رسول اکرم صلعم نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ اے بنی عبدالمطلب! میری اطاعت کرو تو تم سب زمین کے بادشاہ اور حکمران بن جاؤ گے، اور میں تم سے پورے یقین کیساتھ کہتا ہوں کہ اب تک پروردگارِ عالم نے دنیا میں جتنے پیغمبر بھیجے ہیں، ان

میں سے ہر ایک کے لئے ایک وصی، وزیر، بھائی، وارث اور ولی مقرر فرمایا تھا، تو آج تم میں سے کون ایسا جو امر دہے جو میرا وصی، میرا وارث، میرا ولی، میرا بھائی اور میرا وزیر بنے گا؟ اتنا سننا تھا کہ سب پر خاموشی طاری ہوئی، مگر آنحضرت صلعم نے تمام حجت کے طور پر ان میں سے ایک ایک کے سامنے فرداً فرداً یہ دعوت پیش کی، لیکن کسی نے آپ کی دعوت کو قبول نہ کیا، بجز آنکھ میں باقی رہ گیا تھا، اُس وقت میں سب سے کم سن تھا، مگر جب رسول اللہ صلعم نے میرے سامنے اپنی یہ دعوت پیش کی تو میں نے موڈ بانہ عرض کیا کہ اے پیغمبر خدا صلعم! میں آپ کا وصی، وزیر، بھائی، وارث، اور ولی بنوں گا۔ آپ نے فرمایا کہ، ہاں، اے علی! تم ہی میرے وصی، میرے وزیر، میرے وارث، میرے بھائی اور میرے ولی ہو۔

جب بنی عبدالمطلب مجلس سے باہر نکلے تو ابوہلب نے ان سے کہا کہ تم نے آج جو کچھ دیکھا ہے، کیا اس سے تم کو اپنے صاحب محمد کی جادوگری کا ثبوت نہیں ملتا کہ، اس نے تمہارے سامنے دسترخوان پر بکری کی ران رکھی اور دودھ کا پیالہ جس سے تم لوگ خوب سیرشکم ہو گئے، پھر کیا تھا وہ سب کے سب ابوہلب کی اس بات کو سن کر ٹھٹھا کرنے لگے اور حضرت ابوطالب سے کہنے لگے، کہ تمہارا بیٹا تم پر مقدم ہو گیا۔ (اردو عالم اسلام حصہ اول، ص ۳۱-۳۲)۔

مذکورہ بالا حدیثِ مظہر ہے کہ پروردگار عالم نے دنیا میں جتنے پیغمبر بھیجے ہیں، ان میں سے ہر ایک کے لئے ایک وزیر مقرر فرمایا تھا، چنانچہ حضرت آدم کے وزیر مولانا امام شینث علیہ السلام تھے، حضرت نوح کے وزیر مولانا امام اسمعیل

علیہ السلام تھے، حضرت موسیٰ کے وزیر مولانا امام ہارون علیہ السلام تھے، حضرت عیسیٰ کے وزیر مولانا امام شمعون علیہ السلام تھے، اور حضرت محمد مصطفیٰ صلعم کے وزیر مولانا امام علی علیہ السلام تھے۔

یہاں پر ایک اور حدیث کی وضاحت کی جاتی ہے، جو حدیثِ ماثلت ہارونی کے نام سے مشہور ہے، کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **يَا عَلِيُّ أَنْتَ مِنِّي بِمَنْزَلَةِ هَارُونَ مِنْ مُوسَى إِلَّا أَنَّهُ لَا بَنِي بَعْدِي** اے علی! تیرا درجہ مجھ سے ایسا ہے جیسے ہارون کا درجہ موسیٰ سے تھا، مگر یہ کہ میرے بعد (کوئی) پیغمبر نہیں ہے۔

مذکورہ حدیث زبانِ حکمت سے ہمیں یہ تعلیم دیتی ہے کہ بے شک مولانا علی پیغمبر نہیں ہیں، اس لئے وہ ذاتی طور پر ظاہری پیغام پہنچانے کے ذمہ دار نہیں، لیکن جہاں تک خدا اور رسولؐ سے ان کی قربت و نزدیکی اور امرِ نبوت میں شریک ہونے کا تعلق ہے، اس کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے تو ان آیات پر غور کیا جائے جو حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کے بارے میں ہیں، اس کے بعد ان تمام آیات کا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا جائے، جو آنحضرتؐ کے ظاہری و باطنی فضائل و کمالات اور مومنین کے اوصاف کی آئینہ دار ہیں، پھر آپ کو اس حقیقت میں ذرہ بھر بھی شک نہ رہے گا، کہ علیؑ جو عجائب و غرائبِ الہیہ کے منظر ہیں، وزیر کی مرتبت میں حضورِ اقدس صلعم کے ساتھ ساتھ وحیِ آسمانی اور علمِ لدنی سے آراستہ و پیراستہ ہو کر سرچشمہٴ رشد و ہدایت بھی ہیں، اور امیر المومنین کی حیثیت سے اسلام، ایمان، عبادت، ریاضت، حیا، تقویٰ،

صبر، شجاعت، احسان، سخاوت، علم، حلم، حکمت، فضیلت، کرامت وغیرہ جیسی صفاتِ حسنہ میں اہل ایمان کے آگے آگے بھی ہیں، کیوں نہ ہو، جب کہ آپ ہی سزاوار رسول اور شاہِ سبیل کے وزیر ہیں، اور وزیر کا فرض منصبی ہمیشہ سے یہی رہا ہے کہ وہ نہ صرف سلطنت کے نظم و نسق میں بادشاہ کا اولین رازدار، معاون اور مددگار ہوا کرتا ہے، بلکہ ساتھ ہی ساتھ قوانین سلطنت کی پیروی میں رعایا سے سبقت و فوقیت لیا کہ عملی مثال بھی پیش کرتا ہے۔

جب ہم شروع شروع میں قرآن مجید کی ان پُر حکمت آیتوں کو سطحی نظر سے دیکھتے ہیں، جو حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کے قصے میں آئی ہے، تو ہمیں صرف اس قدر معلومات فراہم ہوتی ہیں کہ موسیٰ کی طرح ہارون پر بھی وحی نازل ہوا کرتی تھی، اور وہ موسیٰ کے ذمیر اور خلیفہ تھے، لیکن اس طائرانہ نظر سے یہ ہرگز معلوم نہیں ہو سکتا کہ وہ وزارت کے اس منصبِ اعلیٰ پر مامور ہونے کے بعد کن کن موقعوں پر اور کیسے کیسے حالات میں اپنے بھائی موسیٰ کی حمایت و یاری کرتے رہے؟ یہ سوال بظاہر نہایت ہی پیچیدہ اور سخت دکھائی دیتا ہے، کیونکہ موسیٰ خود ہر موقع پر تبلیغ رسالت میں مصرت نظر آتے ہیں، اور ہارون اکثر ان کے ساتھ ہوتے تو ہیں، مگر خاموش۔

لیکن جب ہم بعد میں ان آیات کی معنوی گہرائیوں میں اتر کر حکمت سے خوب استفادہ کرتے ہیں تو ہم اس حقیقت سے بخوبی واقف و آگاہ ہو جاتے ہیں کہ تمام امورِ دین کے دو دو پہلو ہوا کرتے ہیں؛ ظاہر و باطن، یا تنزیلی اور تاویل، تنزیلی آسمانی کتاب کی ظاہریت کا نام ہے، جس میں احکامِ الہی کے

ظاہری پہلو نظر آتے ہیں، تاویل کتاب کی باطنیت کو کہتے ہیں، جس میں ان احکام کے باطنی پہلو پوشیدہ ہوتے ہیں، چنانچہ حضرت موسیٰ کا تعلق تنزیل سے تھا اور حضرت ہارون کا تعلق تاویل سے، اور یہ ایک لازمی بات ہے کہ جس شخص کا تعلق پوشیدہ کاموں سے ہو، تو اس کی حیثیت بھی پوشیدہ ہو کر رہتی ہے۔

اب اس حقیقت کی دلیل پیش کی جاتی ہے کہ موسیٰ کا تعلق تنزیل سے تھا اور ہارون کا تعلق تاویل سے، وہ اس ارشاد سے ظاہر ہے کہ :

وَ اَخِي هَارُونُ هُوَ اَفْضَحُ مِنِّي لِسَانًا فَأَرْسَلْتُ مَعِيَ رُودًا اَيُّدِي
 فِي اَخَاةٍ اَنْ يُكَذِّبُونَا ۝ ۲۸ اور (موسیٰ نے کہا) میرا بھائی ہارون جو

میری نسبت زبان میں نہ زیادہ فصیح ہے، پس اسے میرے ساتھ مددگار بنا کر بھیجے (تاکہ) وہ میری تصدیق کرے، یقیناً میں ڈرتا ہوں کہ وہ کہیں مجھے نہ جھٹلائیں۔

یہاں موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون کی جس فصاحت کا ذکر کیا ہے، اس سے تاویل مراد ہے، کیونکہ جہاں لوگ تنزیلی امور کے نہ سمجھنے سے نبوت کی تکذیب کرتے ہیں، وہاں تاویل کی روشنی میں ان پر حقیقت ظاہر کر کے نبوت کی تصدیق کی جاتی ہے، ورنہ یہ بات کیسے ممکن ہے کہ جب موسیٰ کہتے ہیں کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں، اور ساتھ ہی ساتھ زبردست معجزات کی صورت میں اس کا ثبوت بھی پیش کرتے ہیں، تو لوگ ان کی تکذیب کرتے ہیں، مگر جب ہارون صرف اپنی ظاہری فصاحت و بلاغت ہی سے ان کو سمجھاتے ہیں، تو وہ جھٹلانے سے باز آ کر موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے قائل ہو جاتے ہیں، بلکہ اس واقعہ کی حقیقت تو یہ ہے کہ ہارون نے تاویل کی روشنی میں نہ صرف اپنی

جسمانی زندگی کے دوران موسیٰؑ کی نبوت کی تصدیق کی بلکہ وہ پورے دور میں جو حضرت عیسیٰؑ کے زمانے تک ہے، اپنے سلسلہ اولاد کی حیثیت میں بھی یہی کام انجام دیتے رہے، کیونکہ یہ توہرگز نہیں ہو سکتا کہ نبوت کی تکذیب و تصدیق نبی کی زندگی تک محدود رہے، اور بعد وفات یہ بحث بالکل ختم ہو جائے چنانچہ امر واقعہ اس کے برعکس ہے، اور وہ یہ ہے کہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا جاتا ہے، تو عوام الناس بھی پیغمبر سے دور تر ہوتے جاتے ہیں۔ اس صورت میں لوگوں پر اتمام حجت اور فرمانبرداریوں کی رہنمائی کے لئے پیغمبر کے وزیر اپنی اولاد کی حیثیت میں موجود ہوتے ہیں، تاکہ پورے دور میں یکسان اور مسلسل طور پر تصدیق نبوت کا کام جاری و ساری رہ سکے۔

اس بیان میں سردارِ رسل صلعم کے وزیر مولانا علیؑ کے بارے میں، جو امام زمان علیہ السلام کی نورانی حیثیت میں ہیں، بہت سے روشن حقائق موجود ہیں جن کا بلا واسطہ اور بالواسطہ دو طرح سے ذکر کیا گیا ہے، اس موقع پر اہل دانش کے لئے علم و عرفان کے یہی تذکرے اور اشارے کافی ہیں۔

موقع عید میلاد النبیؐ _____ سہ شنبہ ۱۲ ربیع الاول ۱۳۹۰ھ

مطابق ۱۹ مئی ۱۹۷۰ء

قرآن کی تنزیل اور تاویل

ظاہر اور باطن:

شیعی امامی اسماعیلیوں کے عقائد میں سے ایک یہ بھی ہے، جو کہتے ہیں کہ قرآن مجید کی ہر آیت، بلکہ ہر لفظ کے دو معنی ہوا کرتے ہیں، معنی ظاہر اور معنی باطن، ظاہر کو تنزیل کہتے ہیں، در باطن کو تاویل، جیسا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس مشہور و معروف حدیث سے واضح ہے:

”وَمَا نَزَّلَتْ عَلَيَّ مِنَ الْقُرْآنِ آيَةٌ إِلَّا وَلَهَا ظَهْرٌ وَبَطْنٌ.“
 مجھ پر قرآن کی (آیات میں سے) کوئی آیت ایسی نہیں اتری ہے، مگر اس کا ایک ظاہر اور ایک باطن ہے۔

تمام باتوں میں تاویل:

چنانچہ خود قرآن مجید کی تعلیمات سے بھی یہی حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ خدا، انبیاء، اور آئمہ برحق علیہم السلام کی مقدس باتوں کے علاوہ ہر طبقے کے لوگوں کی باتوں میں بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر کچھ نہ کچھ تاویل کا دخل ہوتا ہے، خواہ لوگوں کی یہ باتیں حالتِ بیداری میں ہوں یا عالمِ خواب میں۔

حضرت یوسفؑ تمام باتوں کی تاویل جانتے تھے:

حق تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو خاص و عام ہر قسم کی باتوں کی تاویل سکھائی تھی، جیسا کہ قرآن پاک کا ارشاد ہے: **وَرَبِّ قَدْ أَعْلَمْتَنِي مِنَ تَاوِيلِ الْأَحَادِيثِ ۝۱۱** (یوسفؑ نے کہا) اے میرے پروردگار! یقیناً تو نے مجھے (روحانی) سلطنت عطا کی ہے، اور مجھے تمام باتوں کی تاویل سکھائی ہے۔

خواب کی تاویل:

اگر یہاں یہ خیال کیا جائے کہ خدا نے حضرت یوسف کو صرف خوابوں کی تعبیر سکھائی تھی تو درست نہ ہوگا، کیونکہ احادیث کے معنی ہیں باتیں، جن میں خواب کی باتیں بھی شامل ہیں، اور خواب کی تعبیر و تاویل اس وقت ہو سکتی ہے جبکہ اس میں کچھ باتیں پائی جائیں، ورنہ خاموش و بے حس نیند کی کوئی تاویل نہیں۔

پیغمبر اور امام ہر قسم کی تاویل جانتے ہیں:

جب یہ معلوم ہوا کہ اعلیٰ و ادنیٰ ہر قسم کی باتوں میں درجہ بدرجہ تاویل ہوا کرتی ہے، اور اللہ تعالیٰ نے یہ تمام تاویل حضرت یوسفؑ کو سکھائی تھی، تو اس کا پہلا نتیجہ یہ نکلتا ہے، کہ قرآن پاک کی ہر آیت بلکہ ہر لفظ میں تاویل پوشیدہ ہے، دوسرا نتیجہ یہ کہ پیغمبر اور امام علیہما السلام قرآن کی تاویل جانتے ہیں، اور

تیسرا یہ کہ پیغمبر اور امام زمان سے یہ تاویل صرف ان لوگوں کو مل سکتی ہے جو اس کو حاصل کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں، اور پوچھتے ہیں جیسا کہ پوچھنے کا اصول مقرر ہے۔

تاویل اہل یقین کو بتائی جاتی ہے:

حضرت یوسفؑ نے خواب وغیرہ کی تاویل صرف ان لوگوں کو بتائی جنہوں نے ان کی سچائی پر اعمتاً دیکھا، اور یقین کامل سے پوچھا، چنانچہ جو دو جوان حضرت یوسفؑ کے ساتھ قید خانے میں داخل کئے گئے تھے، انہوں نے حضرت یوسفؑ کی علیت سے متاثر ہو کر اپنے اپنے خواب کی تاویل پوچھی، جیسا کہ قرآن کا ارشاد ہے: "ہیں اس کی تاویل بتا دیجئے، یقیناً ہم آپ کو نیکو کاروں میں سے دیکھتے ہیں ۳۶" پھر اس کے بعد ان دونوں میں سے جس کو حضرت یوسفؑ کی تاویلی پیش گوئی کے مطابق نجات ملی تھی اس نے بادشاہ مصر کے خواب کی تاویل پوچھتے ہوئے کہا: "یوسفؑ! اے بڑے سچے! ہمیں اس کی تعبیر دیجئے کہ....."

حصول تاویل کا طریق کار:

ان تذکروں سے بخوبی ظاہر ہوا کہ تاویل کا کوئی حصہ حاصل کرنے کی ولحد شرط یہ ہے کہ صاحب تاویل کی پہچان کے بعد اس کی علمی مرتبت کے لئے اقرار اور اس کی ہدایت پر پورا پورا عمل کیا جائے، اور یہ سمجھ لیا جائے کہ ہر زمانے کا

امام ہی اپنے وقت کا صاحبِ تاویل ہوا کرتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ نے فرمایا:
 انا صاحب التناویل وعلیُّ صاحب التاویل۔ میں تنزیل کا مالک ہوں
 اور علی تاویل کا مالک ہے۔

عملی تاویل:

جاننا چاہئے کہ خدا، پیغمبر، اور امام کی باتوں کے علاوہ ان حضرات کے
 کاموں میں بھی تاویل (یعنی حکمت) ہوتی ہے، چنانچہ سورہ کہف (۱۸) کے
 رکوع ۹ اور ۱۰ کو ذرا غور سے پڑھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جب حضرت
 موسیٰ علیہ السلام مزید علم و حکمت حاصل کرنے کے لئے ایک معجزانہ شخصیت
 کے پاس گیا، تو اس بزرگ نے کچھ ایسے کام کر کے دکھائے جو حضرت موسیٰ
 کے نزدیک قابلِ اعتراض تھے، مگر جب اس بزرگ نے اپنے ان کاموں کی
 تاویل (یعنی حکمت) بتائی تو موسیٰ علیہ السلام اپنے روحانی معلم کے ہر قول و
 فعل کے متعلق مطمئن ہوئے۔

تاویل ہی حکمت ہے:

تاویل کا دوسرا نام حکمت ہے، اور اس کے مقابلے میں تنزیل کو کتاب
 کہا گیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ
 الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُمْ مُدًا عَظِيمًا ۝۱۱۱ يَتْلُونَهَا لِيُذْكَرَ
 كِتَابُ اللَّهِ وَيُحْمَدَ عِزَّهُ وَجَلَالُهُ ۝۱۱۲"۔
 کو کتاب اور حکمت دی اور انہیں ایک بہت بڑی سلطنت دی۔"

اس ارشادِ الہی کی وضاحت یہ ہے کہ، آل ابراہیم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذریت کے انبیاء اور آئمہ علیہم السلام ہیں، کتاب تنزیل ہے، جو پیغمبروں کا حصہ ہیں، حکمت تاویل ہے، جو اماموں کا حصہ ہیں، اور ملکِ عظیم روحانی سلطنت ہے، جو پیغمبروں کو نبوت کے مرتبے میں اور اماموں کو امامت کے درجے میں حاصل ہوتی ہے۔

محکمات و متشابہات :

اگرچہ ہر قرآنی آیت کا ایک ظاہر اور ایک باطن ہے، تاہم بعض آیتیں محکمات کہلاتی ہیں، اور بعض متشابہات، آیت محکمہ وہ ہے جو بظاہر اپنی صراحت کے سبب سے محتاج تاویل نہ ہو، اس کے برعکس آیت متشابہہ وہ ہے، جس کے لئے تاویل کی ضرورت ہو، محکمات کی مثال یہ ہے کہ: **وَاقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ** = اور نماز قائم کرو، اور زکوٰۃ دو۔ اگرچہ اس کا بھی ایک باطن یعنی تاویل ہے، اور وہ یہ ہے: دینِ حق کی دعوت قائم کرو، اور اہل مذہب کو علم حقیقت سکھاؤ۔ تاہم یہ آیت تاویل کی محتاج نہیں، اور متشابہات کی مثال یہ ہے کہ: **وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا** اور سب مل کر خدا کی رستی مضبوطی سے تھامے رہو اور متفرق نہ ہو جاؤ۔ ظاہر ہے کہ خدا کی رستی سے کوئی ایسی چیز مراد ہے جو اپنے معنی کے لحاظ سے کسی قدر رستی سے ہلکتی ہے، اب خدا کی رستی سے جو چیز مراد لی گئی ہے، وہی چیز اس لفظ کی تاویل کہلائے گی، اور خدا کی رستی سے سلسلہ ولایت مراد

ہے، پس اس آیت کی تاویل یہ ہے کہ تم سب مل کر یقین محکم کے ساتھ سلسلہ ولایت کی حقیقی اطاعت کرو، اور اس بارے میں جُدا جُدا عقیدہ نہ رکھا کرو۔“

رَاسُخُونَ فِي الْعِلْمِ :

حق تعالیٰ فرماتا ہے: وَمَا يَعْلَمُ تَاوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسُخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ اور قرآن کی تاویل سوائے اللہ اور ان لوگوں کے جو علم دین میں پختہ کار ہیں، اور کوئی نہیں جانتا وہ کہتے ہیں کہ ہم (بصیرت سے) اس پر ایمان لائے، یہ سب (محکم اور متشابہ آیات اور تنزیل و تاویل) ہمارے رب کی طرف سے ہیں۔

تمام شیعہ مکاتب فکر اس بات پر متفق ہیں کہ ”راسخون فی العلم“ میں سب سے پہلے آنحضرتؐ کا ذکر ہے، کیونکہ آنحضرتؐ علم دین میں پختہ کار تھے اور قرآن کی تاویل جانتے تھے، اور اس کے بعد جملہ ائمہ طاہرین کا ذکر ہے کہ یہ حضرات آپؐ کے بعد علم دین میں پختہ کار ہیں، اور قرآن کی تاویل جانتے ہیں، اور انہوں نے چشم بصیرت سے مشاہدہ کرتے ہوئے باور کر لیا ہے، کہ جس طرح آسمانی کتاب خدا ہی کی طرف سے پیغمبرؐ کو دی گئی ہے، اسی طرح اس کی حکمت بھی خدا ہی کی طرف سے رسولؐ اور ائمہ برحق کو دی گئی ہے۔

میلاد الامام الحاضر

کسی پیغمبر یا امام برحق کی جسمانی ولادت میں عموماً اہل زمانہ کے لئے اور خصوصاً مومنین کے لئے جو کچھ سعادت مندی پوشیدہ ہوتی ہے، اس کے متعلق اعتقاد کی بنیاد صرف روایت اور قیاس ہی پر نہیں، بلکہ یہ ایک ایسی استوار اور روشن حقیقت ہے کہ اس کے ثبوت کے دلائل سے کوئی بھی ذی شعور انسان انکار نہ کر سکے گا۔

چنانچہ قرآن پاک کی روشنی میں اس حقیقت کی توضیح کی جاتی ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء اور آئمہ برحق علیہم السلام کی ظاہری ولادت کی سعادت مندی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کی مثال میں بیان فرمائی ہے، کیونکہ حکمت الہیہ کا تقاضا یہ تھا کہ انبیاء اور آئمہ برحق علیہم السلام کی جسمانی ولادت اور ان کی بشریت کی سعادتوں اور برکتوں کا ذکر ایک ایسے پیغمبر کی پیدائش کی مثال میں کر دیا جائے جس کی ولادت اور بشریت کے متعلق بے معرفت لوگوں کو زیادہ سے زیادہ شک اور اعتراض ممکن تھا، وہ پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے، کیونکہ ان کی پیدائش اور بشریت اس مطلب کے لئے ایک بہترین مثال ہو سکتی تھی، اس لئے کہ مختلف زمانے کے منکرین نے دوسرے انبیاء اور اولیاء کی جسمانیت پر جو کچھ اعتراض اٹھایا، وہ تو اکثر یہی ہوا کرتا تھا، کہ

انہوں نے انبیاء و اولیاء کو اپنی طرح کے انسان قرار دیا، جس کی ترجمانی قرآن پاک اس طرح کر رہا ہے:

قَالُوا مَا أَنْتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُنَا ۗ (۳۶) ، ان لوگوں نے کہا کہ تم تو کچھ بھی نہیں، مگر ہماری طرح (محض) معمولی آدمی ہو۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش و بشریت پر منکرین نے جو کچھ اعتراض اٹھایا، اس کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد یہ ہے: قَالُوا يَا مَرْيَمُ اقْنُتِي لِمَا قَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا ۗ (۱۹) لوگوں نے کہا کہ اے مریم! تم نے بڑے غضب کا کام کیا۔ یعنی انہوں نے کہا کہ ہماری طرح کا انسان تو درکنار یہ بولو دوسرے سے حلال زادہ ہی نہیں، پس معلوم ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش اور بشریت انبیاء و اولیاء کی مجموعی زندگی کی ایک ایسی جامع مثال ہے کہ جس میں اگر ایک طرف سے منکرین کے سخت سے سخت اعتراض کا ذکر موجود ہے، تو دوسری طرف سے اس میں اس اعتراض کی تردید کر کے انبیاء و اولیاء کی پیدائش و بشریت کے فیوض و برکات کا بھی انتہائی جامع الفاظ میں ذکر کر دیا گیا ہے، اور اس سلسلے میں قرآن پاک کا ایک ارشاد یہ ہے: وَجَعَلْنِي مَبْدَاً كَأَآيِنِ مَا كُنْتُ (۱۹) اور خدا نے مجھے برکت والا بنایا، میں جہاں کہیں بھی ہوں۔ اس مطلب کی تشریح یہ ہے، کہ حضرت عیسیٰؑ مذکورہ اعتراض کی تردید میں اپنی پیدائش اور جسمانیت کے فیوض و برکات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں، کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے برکت والا بنایا، پس میں جہاں جاؤں، جن لوگوں کے درمیان رہوں، اور جن اشخاص کی طرف روحانی توجہ کروں، تو وہاں پر اور ان لوگوں کو برکت مل سکتی ہے، پھر ظاہر ہے کہ پیغمبر اور امام برحقؑ کے ظاہری

وجود ہی امت وجماعت کے لئے باعثِ فیض و برکت ہے، اس لئے کہ آئینِ مآ کنت کا اشارہ سب سے پہلے روحانی پیشوا کے مبارک وجود اور جائے سکونت کی طرف ہے، چنانچہ مذکورہ آیت سے یہ ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ جہاں رہتے تھے، ان کے ساتھ برکت تھی، تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ وہ برکت حضرت عیسیٰ سے جُدا نہ تھی، اور صرف انہی کی خوشنودی سے کسی کو مل سکتی تھی، پھر اس جسمانی وسیلے کے بعد حضرت عیسیٰ کی روحانی توجہ اور نظر ممکن تھی۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ برکت کی حقیقت و کیفیت کیا ہے؟ جس کا جواب یہ ہے کہ برکت ایمان، جان، اولاد، اور مال کی لازوالی اور زیادتی کا نام ہے، پس انسان کو جن چیزوں میں برکت کی ضرورت ہے، وہ بس یہی چیزیں ہیں، اور انسان کی ان چیزوں میں ہر ممکن برکت حاصل ہونے کا جو ذریعہ ہے، وہ پیغمبر اور امام برحق کی ظاہری ہدایت ہے، یہی وجہ تھی جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے اس قول میں یہ منطق پوشیدہ رکھی، کہ اپنے زمانے کی ساری برکات مجھ میں ہیں، یعنی فیوض و برکات شروع شروع میں ہدایت کی صورت میں ہوتی ہیں، تو معلوم ہوا کہ پیغمبر اور امام برحق کا ظاہری وجود ہی سرچشمہ ہدایت اور ذریعہ برکت ہے۔

مزید برآں برکت کی ایک خاص حقیقت اور بھی ہے، وہ ہے ایمان، جان، اولاد اور مال کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ دینی اور روحانی فوائد کا حاصل ہونا، پس یہی لازوال اور ابدی برکت ہے، اور یہ برکت تمام دنیاوی برکتوں سے برتر ہے، پس انبیاء اور آئمہ برحق اپنی ہدایت کے ذریعہ مومنین کو یہی

برکت دیا کرتے ہیں، اور اسی برکت کو حاصل کرنے کے لئے انہیں تاکید فرماتے ہیں۔
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے بارے میں ایک اور قرآنی جامع حقیقت
یہ ہے، کہ انسانِ کامل (یعنی نبی اور ولی) پر تین موقعوں میں ملائکہ اور روحانیاتین کا

زیادہ سے زیادہ نزول ہوا کرتا ہے، وہ مواقع ان کے یوم پیدائش، یوم وفات
اور یوم بعثت ہیں۔ چنانچہ قولِ قرآن ہے: "وَالسَّلَامُ عَلٰی یَوْمٍ وُلِدَتْ وَ
یَوْمِ امُوتٍ وَیَوْمِ اُبْعِثَتْ حَیًّا مَلٰٓئِکَہٗ" اور تائید (یعنی نزولِ ملائکہ کا موقع)

ہے، میرے لئے جس دن میں پیدا ہوا، اور جس روز رحلت کروں گا، اور جس
روز زندہ کر کے اٹھایا جاؤں گا۔" سلام کے خاص معنی تائید یعنی نزولِ ملائکہ و
ارواح کے ہوتے ہیں، جس طرح خدا تعالیٰ کے اس فرمان سے ظاہر ہے :-

قَتَّلُوا الْمَلَائِکَةَ وَالرُّوحَ فِیْهَا یَاذُنِ رَبِّہُمْ مِنْ کُلِّ اَمْرِ سَلَمٌ
ہی حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ ط ۱۹۷) وہ رات (یعنی شبِ قدر ایسی ہے، کہ

اس میں ملائکہ اور ارواح اپنے پروردگار کے اذن پر پورے عالمِ امر سے
نازل ہوتے رہتے ہیں (اس لئے) وہ رات طلوعِ فجر تک موقعِ تائید ہے،
یہاں پر ثبوت ہوا کہ نزولِ ملائکہ و ارواح کا نتیجہ ہی سلام یعنی تائید ہے۔

پس امام زمان کے یوم پیدائش کی سعادت و برکت مذکورہ آیات کی روشنی
میں معلوم کی جاسکتی ہے، کیونکہ پیغمبر اور امام برحق کا نور فی الاصل ایک ہی
زندہ روح کی حیثیت سے ہے۔

والسلام

امام برحقؑ کا دیدارِ فیضِ آثار

امامِ حقیقہ و حاضر کے دیدارِ فیضِ آثار کی اہمیت و افادیت اور قدر و منزلت کے بارے میں کچھ حقائق پیش کرنے سے قبل یہ لازمی امر ہے کہ قرآن و حدیث کی روشنی میں بطریقِ اختصار یہ ذکر کر دیا جائے کہ دینِ اسلام میں اللہ تعالیٰ کے نورانی دیدار اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظاہری دیدار کا کیا تصور و عقیدہ ہے، تاکہ مومنین اس واضح بیان سے امامِ زمانہ کے دیدارِ اقدس کی حقیقت و حکمت کو بخوبی سمجھ سکیں۔

دیدار کا تذکرہ:

چنانچہ اگر کوئی ذی علم اور صاحبِ بصیرت انسان قرآنِ حکیم کی معنوی گہرائی تک رسا ہو کہ غور و فکر کرے، تو یقیناً اس پر یہ حقیقت منکشف ہوگی، کہ قرآنِ حکیم کی تمام آیاتِ مقدسہ حکمت کے انداز میں نورانی دیدار کے تذکروں سے بھری ہوئی ہیں، اور ان میں کوئی بھی آیت ایسی نظر نہیں آتی جو اس تذکرہ سے بالکل خالی ہو، چنانچہ ذیل میں قرآنِ شریف کا ایک ایسا کلیتہً درج کیا جاتا ہے کہ جس سے یہ مطلب صاف طور پر ظاہر ہوگا کہ کائنات و موجودات اور قرآن کا

کا کوئی ایسا جزو نہیں، جو اپنے کسی نہ کسی پہلو سے حق تعالیٰ کے جمال و جلال کی آئینہ داری نہ کرتا ہو اور وہ کلمہ یہ ہے :

”فَاَيَّمَنَا تَوَلَّوْا فَاَنصِبْ وَّجْهَكَ لِلدِّينِ الْحَقِّ“ پس تم جس طرف بھی متوجہ ہو جاؤ، وہیں خدا کا چہرہ موجود ہے۔“ خدا کے چہرے سے نورانی دیدار، اور معرفت مراد ہے، اور ”آئین“ کا لفظ تمام عرصہ زمان و مکان اور جملہ حالات کی طرف اشارہ کرتا ہے، پھر اس کے معنی یہ ہوئے کہ اول، آخر، ظاہر اور باطن کے تمام مقامات و حالات میں نورِ الہی کی کوئی نہ کوئی جلوہ نمائی موجود ہے، اور اہل بصیرت ہر وقت، ہر جگہ اور ہر حالت میں دیدارِ خداوندی کے فیوض و برکات سے مستفیض ہو سکتے ہیں، پس معلوم ہوا کہ جس طرح عین الیقین کے درجے میں کائنات کی ہر چیز کے باطن میں دیدارِ الہی کا جلوہ نظر آتا ہے، اسی طرح علم الیقین کے مقام پر قرآن حکیم کی ہر آیت، ہر جملہ، اور ہر لفظ کی حکمت میں اس پاک دیدار کے متعلق کوئی نہ کوئی تذکرہ پایا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا تاویلی حقیقتوں کے علاوہ قرآنِ پاک میں ایسی بہت سی آیتیں ہیں، جن میں دیدارِ ربّانی کا واضح طور پر بیان آیا ہے، ہم یہاں ان تمام آیات میں سے صرف چار آیتوں کی وضاحت پر اکتفا کرتے ہیں، کیونکہ وجود و ہستی کے چار حالات کے اعتبار سے دیدارِ الہی کے مقامات چار ہیں، جیسا کہ حق تعالیٰ کا فرمان ہے : هُوَ اَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَلَطْنَا مِنْهُ عَلَى الْخَلْقِ كُلِّ لِيَأْخُذَ مِنْهُمْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۗ وَالَّذِينَ لَا يُؤْتُونَ مَالًا سَرِيًّا وَلَا ضَعُفًا ۗ وَالَّذِينَ لَا يُؤْتُونَ مَالًا سَرِيًّا وَلَا ضَعُفًا ۗ وَالَّذِينَ لَا يُؤْتُونَ مَالًا سَرِيًّا وَلَا ضَعُفًا ۗ

۴۵۔ وہی سب سے پہلے ہے، اور وہی سب سے پیچھے ہے، اور وہی

سب سے آشکارہ ہے اور وہی سب سے مخفی ہے۔

”هُوَ الْأَوَّلُ“ کا اشارہ:

پہلی آیت جو مقامِ اوّل کے دیدار کے بارے میں ہے، یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابتداء میں ارواح کو مخاطب کر کے فرمایا ”الَّتِیْ بَرَّیْتُمْ“ (۱۲۱) کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ قَالُوا بَلٰی شَهِدْنَا (۱۲۲) انہوں نے کہا کیوں نہیں ہم (سب اس واقعہ کے) گواہ بنتے ہیں۔ ”ظاہر ہے، کہ اس وقت ارواح سے خدا تعالیٰ کی ہستی اور ربوبیت کی عینی گواہی لی گئی تھی، اور ان تمام روحوں کو رب العزت کے نورانی دیدار کا شرف حاصل ہوا تھا، کیونکہ حکیم مطلق کے حقیقی عدل کی رو سے یہ ہرگز مناسب نہیں کہ کچھ لوگوں سے کسی ایسے واقعے کی شہادت پوچھ لی جائے، اور ان کو گواہ بنایا جائے، جب کہ وہ واقعہ ان پر تاریک اور چھپا ہوا ہے، اور وہ لوگ اُس سے بالکل نابلد اور قطعاً ناواقف ہیں۔ پس یہ حقیقت ثابت ہوئی کہ روحوں کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کی یہ گواہی دیدار اور جملہ صفاتِ کمالیہ کی روشنی میں تھی۔

”وَالْآخِرُ“ کا اشارہ:

دوسری آیت جو مقامِ آخر کے دیدار کے بارے میں ہے، یہ ہے: ”مَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ اللَّهِ فَإِنَّ أَجَلَ اللَّهِ لَآتٍ ط (۲۹) جو شخص

خدا کے دیدار کی امید رکھتا ہو، تو خدا کے وعدے کا دن ضرور آنے والا ہے۔“
اس ارشادِ ربّانی میں اس دیدار کا ذکر آیا ہے جو مستقبل اور آخرت میں
مومنین کے لئے میسر ہونے والا ہے۔

”وَالتَّاهِرُ“ کا اشارہ :

تیسری آیت جو مقامِ ظاہر کے دیدار کے باب میں ہے، یہ ہے جو فرمایا گیا
کہ: **اللَّهُ نُورٌ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ** ط (۱۴) اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین
کا نور ہے۔ اور نور کی تعریف یہ ہے کہ وہ بذاتِ خود روشن اور ظاہر ہے،
اور کائنات کی تمام چیزوں کو بھی منور و آشکار کر دیتا ہے، چنانچہ اگر کوئی شخص
آفتابِ عالمِ تاب کو دیکھنا چاہے تو خود اسی کی روشنی میں دیکھ سکتا ہے، نہ
کسی اور چیز کی روشنی میں، اس کا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا نورانی دیدار
حالتِ ظہور میں بھی ہے، مگر یہ دیدار خود نور ہی کے وسیلے سے حاصل کیا
جا سکتا ہے، نہ کسی اور ذریعے سے، جیسا کہ ارشاد ہے: **يَهْدِي اللَّهُ**
لِنُورِهِ مَن يَشَاءُ (۱۴) اللہ تعالیٰ اپنے نور تک جس کو چاہتا ہے،
راہ دے دیتا ہے :

”وَالْبَاطِنُ“ کا اشارہ :

چوتھی آیت جو مقامِ باطن کے دیدار کے سلسلے میں ہے، یہ ہے
جو حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَأَسْأَلُكَ الْيَهَارَ وَحَتَّىٰ تَمُوتَ لَهَا**

بَشَرًا سَوِيًّا (۱۹) پس ہم نے مریمؑ کے پاس اپنی رُوح یعنی نُور بھیجا، اور وہ ایک (ہر طرح سے) صیحح انسان کے روپ میں اس کے سامنے ظاہر ہوا! اس مقام پر یہ بات قابل ذکر ہے، کہ اگر رُوح القدس حضرت مریمؑ کے سامنے انسانی صورت میں ظاہر ہوئی، تو اس کا ہر گز یہ مطلب نہیں، کہ پھر وہ اس وقت رُوح نہ رہی، اور جسم بن گئی، بلکہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ رُوح القدس مقام روحانیت پر رُوح ہی تھی، ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے جسمانی مظہر کے ذریعہ ظہور پذیر بھی تھی، پس اس بیان سے یہ ثابت ہوا کہ اس آیت کی حکمت میں دیدارِ ظاہر اور دیدارِ باطن دونوں کی دلیل موجود ہے، چنانچہ یہاں ایک مناسب مثال بیان کر دی جاتی ہے، کہ سورج اگرچہ ظاہر ہے، تاہم وہ باطن بھی ہے، کیونکہ اس کا اندرونی اور عقبی حصہ حجابِ نور میں پوشیدہ ہونے کی وجہ سے ظاہر نہیں، اس کے یہ معنی ہوئے کہ سورج نے اپنے آپ کو بیک وقت ظاہر بھی کر دیا ہے اور چھپا بھی لیا ہے، یہی مثال دیدارِ ظاہر اور دیدارِ باطن کی بھی ہے۔

رسول اکرمؐ کا دیدار :

اب ہم حضرت محمد مصطفیٰ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبارک دیدار کے بارے میں ایک مشہور حدیث اور کچھ فکر انگیز الفاظ درج کرتے ہیں، کہ آنحضرتؐ کا ارشاد گرامی ہے: "مَنْ رَأَىٰ فَقَدْ رَأَىٰ اللّٰهَ ط" جس شخص نے میرا دیدار کیا پس اُس نے خدا کا دیدار کیا۔" اس حدیث

شریف میں دو باتوں کا خصوصیت کے ساتھ اشارہ کیا گیا ہے، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کے پاک دیدار کا حصول حقیقی مومن کے لئے ایک انتہائی ضروری امر ہے، دوسری یہ کہ اُس مقدس دیدار کے لئے واسطہ اور وسیلہ صرف انسانِ کامل ہی ہے کیونکہ اگر یہ عقیدہ رکھا جائے کہ اس دنیا میں ہمیشہ کیلئے روح القدس یعنی خدا کے لُز کا نزول ہوا ہے، تو لازمی طور پر یہ بھی ماننا ہی پڑے گا، کہ انسانِ کامل یعنی پیغمبر اور امام کے سوا اور کوئی مخلوق اس مقدس اور عظیم نور کے لئے نہ تو حامل بن سکتی ہے، اور نہ ہی اس سے دوسروں کو کوئی فائدہ پہنچا سکتی ہے۔

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنی روح یعنی نور حضرت مریمؑ کے پاس بھیجا تو وہ انسانِ کامل ہی کی صورت میں ظاہر ہوا، اور قانونِ الہی کی رُو سے یہی ممکن اور مناسب تھا، کہ جو رُوح یا نور عالمِ ملکوت سے عالمِ ناسوت میں نازل ہوا ہے، تو اُسے سب سے پہلے بشریت کے بلند ترین درجے میں آنا چاہئے اور وہ بلند ترین درجہ اور عظیم ترین مرتبہ نبوت اور امامت کے نام سے ہے۔

قرآنِ پاک میں فرمایا گیا ہے کہ صاحبِ امر کی اطاعت رسولؐ کی اطاعت ہے، اور رسولؐ کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے، اور ارشاد ہوا ہے کہ اگر رسول اللہؐ کو کچھ دے کہ ان کی خوشنودی حاصل کرنی ہے، تو بس یہی کہ تم رسولؐ کے قربت داروں سے دوستی اور محبت رکھا کرو، نیز ارشاد ہے کہ خدا کی خاص دوستی حاصل کرنے کے لئے رسولؐ کی فرمانبرداری کی جائے۔ اس نوع کی آیتوں کی تعلیمات کا نتیجہ نکلتا ہے، کہ جس طرح پیغمبرؐ اور امام زمانؑ کی فرمانبرداری خدا کی

فرمانبرداری ہے، ان حضرات کی محبت خدا کی محبت ہے، اور ان کی خوشنودی خدا کی خوشنودی ہے، بالکل اسی طرح ان کا دیدار بھی خدا کا دیدار ہے۔

امام زمان کا دیدار :

سیدنا قاضی نعمان کی ایک مشہور تصنیف "کتاب الہمہ فی آداب اتباع الائمہ" کے صفحہ ۲۶ پر اس حدیث مرفوعہ کا ذکر کیا گیا ہے: "ان النظر الی الامام عبادۃ والنظر الی المصلف العبادۃ" تحقیق امام کی طرف دیکھنا ایک قسم کی عبادت ہے، اور قرآن کی طرف دیکھنا بھی ایک طرح کی عبادت ہے۔ قاضی نعمان صاحب پھر اپنے الفاظ میں فرماتے ہیں کہ بھول اور غفلت کی نگاہ سے امام کی طرف دیکھنے میں کوئی عبادت نہیں بلکہ غور و فکر کی نظر سے دیکھنے میں عبادت ہے، جس طرح سوچے سمجھے بغیر قرآن کی طرف دیکھنے والے کو اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا، جیسے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

” اَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَاۙ“

پس کیا وہ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر قفل ہیں۔ پس اس بیان سے جو امام اور قرآن کی طرف دیکھنا اور غور و فکر کرنے کے بارے میں ہے، یہ ظاہر ہوا کہ امام حق و حاضر کے مبارک اور پُر حکمت دیدار کے فیوض و برکات حاصل کرنے میں تمام مومنین و مومنات ایک جیسے نہیں، بلکہ وہ سب اپنی اپنی عقیدت، محبت، معرفت اور فرمانبرداری کے لحاظ سے مختلف درجات پر ہیں، کیونکہ جس طرح قرآن فہمی کے اعتبار سے لوگوں کے بے شمار درجے ہوتے

ہیں، اسی طرح امام شناسی کے لحاظ سے بھی ان کے لائقہ از مرتب ہیں۔
 اخیر میں جو کچھ مناسب اور موزون بات کہی جاسکتی ہے، وہ یہ ہے کہ امام
 زمانہ کی تشریف آوری اور دیدارِ اقدس کی رحمتوں اور برکتوں سے دینی اور دنیاوی
 طور پر صرف وہی حقیقی مرید پورا پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو اس مبارک موقع پر
 اپنے تمام اعمال کا باریک بینی سے احتساب کریں، اپنی ناپستیدہ عادتوں، اور
 نافرمانیوں سے درت بردار ہو جائیں، اور اپنے دل میں امام زمانہ سے یہ وعدہ
 کریں کہ وہ آئندہ کسی بھی قسم کی نافرمانی کے مرتکب نہ ہوں گے، عبادت میں کوئی
 کوتاہی نہ کریں گے، اور امام کے کسی بھی مرید کی دل آزاری نہ کریں گے، پس اسی
 صورت میں اہل ایمان کو امام عالی مقام کے پاک دیدار کا لازوال ثمرہ حاصل ہو
 سکتا ہے، اور اپنے مریدوں کے پاس امام زمانہ کے تشریف لانے اور ان کو
 دیدار کرنے کا اصل مقصد بھی یہی ہوتا ہے۔

(پاکستان میں امام زمانہ کی تشریف آوری کے موقع پر)

تحریر: ۱۵ جنوری ۱۹۷۰ء

ایک نایاب گران مایہ اور قدیم علمی خزانے کا ایران میں انکشاف

اسماعیلیہ دنیا کے علمی مراکز میں سے ایک عظیم مرکز ایران رہا ہے، اور یہ سب کچھ ایران میں آئٹز برحق کے تشریف آوری اور زمانہ دراز تک وہاں ان کے قیام پذیر ہونے کے بدولت ہے، چنانچہ حال ہی میں بعض اہل علم ایرانہ اسماعیلیوں نے ”دیوانہ قائمات“ کے نام سے ایک منظوم کتابہ کے علمی نسخے کا انکشاف کیا ہے، انہ کا کہنا ہے کہ یہ دیوانہ مولانا علی ذکرہ السلام کے عہد مبارک کے نامور شعراء کے چیدہ چیدہ نظموں کا ایک بہترین مجموعہ ہے۔ جنابہ محترم سید جلال الحسینی بدخشافہ صاحب نے درج ذیلہ قصیدہ اسی دیوانہ سے بدیئہ و نمونہ اسماعیلیہ ایسوسی ایشن پاکستان کو بھیجا ہے، جسے ادارہ ازلانے اردو ترجمے کے ساتھ آپ کو خدمتوں میں پیش کیا تھا۔

قصیدہ منتخب از دیوان قائمات

ہر دل کہ بارضای امام آشتنا شود
بے یسبح شک نشانہ امر خدا شود (۱)

ترجمہ: ہر دل جو امام عیلا سلام کی خوشنودی سے واقف ہو جائے اس میں کوئی شک ہی نہیں کہ وہ خدا کے امر کا نشانہ یعنی توفیق و ہدایت نازل ہونے کا مقام بن جاتا ہے۔

آن بندہ باشد آنکہ بمعنی منزلت
میرساکنانِ عالمِ جان بادشاہ شود (۲)

ترجمہ: وہ بندہ (اس خوشنودی کی بدولت) اس قابل ہو جاتا ہے، کہ وہ حقیقت اور
مرتب میں رُوحانی عالم کے باشندوں پر بادشاہ ہوگا۔

جائے رسد بقوہ روح القدس کہ خاک
در زیرِ نعلِ مرکبِ او کیمیا شود (۳)

ترجمہ: وہ شخص روح القدس کی قوت و تائید سے ایک ایسے (بندہ) مقام پر پہنچتا ہے
کہ اس کے گھوڑے کے نعل کے نیچے مٹی کیمیا (یعنی سونا) بن جاتی ہے۔

نقشِ شریفِ او بمعانی در ارتقاء
زینِ عشوہ شواغلِ حسن مرقفا شود (۴)

ترجمہ: اُس کا شریف نقش (یعنی رُوحانی مشاہدہ) عقائد کے ذریعہ ارتقاء و عروج
کے سلسلے میں حسی مشنلوں کے اس فریب سے (گزر کر) بلند ہو جاتا ہے۔

نورِ ضمیرِ او بکرامات و معجزات
خورشیدِ اوجِ کنگرہ کبریا شود (۵)

ترجمہ: اُس کے ضمیر کا نور (روحانی) کرامات و معجزات (کے سلسلے) میں بزرگی کی چوٹی کی
بلندی کا سورج بن جاتا ہے۔

(۶) انصارِ دین و دعوتِ حق را در اعتقاد
ہم پیشواۓی مطلق و ہم مقتدا شود

ترجمہ: وہ شخص اعتقادی طور پر دین کے مددگاروں اور دعوتِ حق کرنے والوں کے لئے حقیقی پیشوا اور رہنما ہو جاتا ہے، یعنی اس کی روح کی اصلیت امامِ زمان کی ہستی میں موجود نظر آنے لگتی ہے۔

(۷) بان اے حسن نہ موسم آن است کز ہوس

جان و دل تو جعبہ تیر ہوا شود

ترجمہ: خبردار اے حسن (اب) وہ وقت نہیں کہ حرص و ہوس کی وجہ سے تیری جان اور دل نفسانی خواہشات کے تیروں کا توکش ہو جایا کریں۔

(۸) یا باز فکر و ہم تو در کسبِ جاہ و مال
موقوف این نشمینِ خوف ورجا شود

ترجمہ: یا (یہ کہ تیری فکر اور وہم کا باز (دنوی) عزت اور مال کمانے کے لئے اس خوف اور امید کے ٹھکانے میں ٹھہرا رہے۔

(۹) یا ہمتِ تو از رہِ آرزو نیاز و حرص
مشتاقِ این سرایِ مجاز و فنا شود

ترجمہ: یا (یکہ) طمع، احتیاج اور حرص کے طریقے پر تیری ہمت اس مجاز و فنا کے گھر (یعنی دنیا) ہی کی مشتاق ہو جایا کرے۔

(۱۰) می دان کہ حُبِ جاہِ یلانی بُوَد عظیم
کا بلیس باشد آنکہ بآن مبتلا شود

ترجمہ: جان لے کہ (دنیوی) عزت کی محبت ایک عظیم بلا ہے، کیونکہ جو شخص اس میں
گمراہ ہوجائے تو وہ ا بلیس بن جاتا ہے۔

(۱۱) مور است حُبِ مالِ مرورا امان مدہ
کان مور مار گمرد و مار اژدہا شود

ترجمہ: دولت کی محبت گویا حریص چوٹھی ہے تو (اپنے اندر) اس کو نہ رہنے دے، کیونکہ
وہ چوٹھی تو سانپ بن جاتی ہے، اور وہ سانپ اژدہا بن جاتا ہے۔

(۱۲) وقت است گردل تو بتوفیق ذوالجلال
زین کائنات عالمِ خاک کی جسد ا شود

ترجمہ: اگر خدائے بزرگ کی توفیق سے تیرا دل اس عالمِ خاکی کی موجودات سے یکسو ہوجائے
تو عین موقع ہے۔

(۱۳) ذاتِ تو در جماعتِ قائم با اختیار
شائستہ متابعتِ اولیاء ا شود

ترجمہ: دورانِ حال تیری ذاتِ جماعتِ قائمہ کے ساتھ منتخب ہو کر اولیاء اللہ یعنی ائمہ برحق
کی پیروی کے قابل ہوگی۔

تائیدِ نور بخش خداوندِ حق تبارک
بخشندهٔ سعادتِ بے منتہا شود (۱۴)

ترجمہ: (پھر اس وقت) امامِ برحق کی وہ تائید جو نورِ عطا کہ دینے والی ہے، تجھے
کبھی ختم نہ ہونے والی سعادت بخشے گی۔

صاحبِ زمان کہ بہرِ سجودِ جنابِ او
مہرِ لفظِ پشتِ عالمِ اعلیٰ دو تا شود (۱۵)

ترجمہ: صاحبِ زمان (کی نشان ہے) کہ ان کے حضور میں سجدے کے لئے عالمِ بالا کی
پشتِ ہمیشہ جھکی ہوئی ہوتی ہے۔

مولا محمدؑ آنکہ اثرِ خاکِ پائی او
در چشمِ عقلِ سرمہٗ کشفِ العطا شود (۱۶)

ترجمہ: مولانا محمد علیہ السلام وہ ہیں جن کی خاکِ پا کا اثر عقل کی آنکھ سے (روحانی تاریکی
کا) پردہ ہٹا دینے والا سرمد بن جانا ہے۔

ای آنکہ بے اجابتِ تو نیست در وجود
کہ یسج بابِ حاجتِ عالمِ روا شود (۱۷)

ترجمہ: اے وہ ہستی جو آپ کی قبولیت کے سوا یہ امر ممکن اور موجود نہیں کہ دنیا والوں
کی حاجت کھھی اور سبب سے روا ہو جائے۔

گر سایہ سَحَطِ فِگنی پر فرشتہ

(۱۸)

دیو زمانہ گرو دو کارش بہا شود

ترجمہ: اگر آپ کسی فرشتہ پر ناخوشنودی کا سایہ ڈالیں تو وہ زمانے کا شیطان بن جاتا ہے، اور اس کا (تمام سابقہ نیک) عمل ناپسند ہو جاتا ہے۔

ور دیو را بحشیم عنایت کنی نگاہ

(۱۹)

ہمچون فرشتہ معدن صدق و صفا شود

ترجمہ: اور اگر آپ شیطان کو مہربانی کی نظر سے دیکھیں، تو وہ فرشتہ ہی کی طرح صدق و صفا کی کان بن جاتا ہے۔

زند ان سسرائے حادثہ بر بندگان تو

(۲۰)

از رحمت تو روضہ دار البقا شود

ترجمہ: (اگر آپ چاہیں تو) حادثات کا قید خانہ (یعنی یہ دنیا) آپ کے بندوں کیلئے آپ کی رحمت سے عالم بقا کی بہشت بن جاتا ہے۔

این بندہ ضعیف کہ از ترس فعل خویش

(۲۱)

رنگ رخس ہمی بصفت کہر با شود

ترجمہ: (آپ کا) یہ عاجز بندہ ایسا ہے کہ اپنے عمل کے خوف سے اس کے چہرے کے رنگ کہر یا کے رنگ کی طرح ہو جاتا ہے۔

از غایتِ فسادِ خیالات ، میر زمان
 بروئی ہمی صواب دو گیتی خطا شود (۲۲)

ترجمہ : ہمیشہ خیالات کی انتہائی خوبی کی وجہ سے اس کے دونوں جہان کا درست کام قلمط ہو جاتا ہے۔

لیکن بعزت و قدرِ مطیعانِ عہد تو
 گیر و امید با سر و رد و دعا شود (۲۳)

ترجمہ : لیکن وہ آپ کے زمانے کے حقیقی فرمانبرداروں کی عزت و قدر کے وسیلے سے توقع رکھتا ہے اور ورد و دعا کے خیال میں رہتا ہے۔

تا بُو کہ از شفاعتِ ایشان در آن نفس
 کین مرغِ جان ازین قفسِ تن جُدا شود (۲۴)

ترجمہ : تاکہ ان کی سفارش حاصل ہو، اُس وقت جبکہ رُوح کا پرندہ جسم کے اس قفس سے نکل جاتا ہے۔

جشن نوروز کا ایک اور پہلو

اس سیارہ زمین کی پیدائش سے لے کر اب تک نوروز کے موقع پر جتنے بھی عجیب و غریب اور انتہائی عظیم واقعات رونما ہوئے ہیں، اتنے واقعات کسی اور موقع پر نہیں ہوئے ہوں گے، چنانچہ علامہ مجلسی کی کتاب زاد المعاد کے حوالے سے یہ روایت بیان کی جاتی ہے، کہ حضرت امام جعفر الصادق علیہ السلام نے فرمایا کہ نوروز وہ مبارک دن ہے، جس میں خداوند عالم نے بندوں کی روحوں سے یہ اقرار لیا کہ وہ اس کو خدائے واحد سمجھیں، جیسا کہ قرآن پاک کا ارشاد ہے :-

”اور (وہ وقت یاد کرو) جب کہ تمہارے پروردگار نے اولادِ آدمؑ کی پشتوں سے ان کی اولاد کو لیا، اور انہیں ان کی اپنی اپنی ذات پر گواہ قرار دیا (اور ان سے پوچھا) کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں، انہوں نے کہا، ہاں ہم گواہی دیتے ہیں (آپ ہمارے پروردگار ہیں، یہ اقرار اس لئے لیا) تاکہ تم قیامت کے دن یہ نہ کہو کہ یقیناً ہم اس سے بالکل بے خبر تھے۔“ (الاعراف، ۱۷۲)

مذکورہ روایت کے مطابق نوروز ہی تھا، جس میں حضرت نوحؑ کی کشتی طوفانِ تھم جانے کے بعد کوہِ جودی پر بٹھری، حضرت ابراہیمؑ نے اسی روز ملک عراق کے شاہی بتوں کو توڑ ڈالا تھا، حضرت موسیٰؑ نے اپنے زمانے میں اسی

دن فرعونِ مصر کے جادوگروں کو شکست فاش دے دی تھی، اور آنحضرتؐ نے بھی اسی نوروں کے موقع پر مولانا علیؒ کو اپنے مبارک کندھوں پر چڑھا کر خانہ کعبہ کے تین سو ساٹھ بتوں کو توڑوایا تھا، نوروں کے متعلق ایسی قسم کی بہت سی روایات مشہور ہیں، لیکن پھر بھی اس یوم سعید کی بہت سی حقیقتیں ہو سکتی ہیں، جو اب تک پردہ راز میں پوشیدہ رہی ہوں۔

اس امر واقع میں کوئی شک ہی نہیں، کہ پیغمبر خدا، اور آپ کے حقیقی جانشین کے نزد کے بغیر اگر اس دنیا اور اس کے باشندوں کے ماضی و مستقبل کی طرف دیکھا جائے، تو ایک انتہائی تاریک تصور کے سوا وہاں کچھ بھی نظر نہیں آئے گا، جیسا کہ قرآن پاک کے اس ارشاد میں یہی مثال مذکور ہے:

”اور ہم نے ان کے سامنے ایک دیوار کر دی، اور ان کے پیچھے ایک دیوار کر دی، پھر ہم نے انہیں ڈھانپ لیا، پس وہ دیکھ نہیں سکتے“ ^{۳۱} _۹

سامنے سے مستقبل اور ابد مراد ہے، اور پیچھے سے ماضی اور ازل مراد ہے، پس ظاہر ہے، کہ جو لوگ خدا اور رسول کے حقیقی فرمانبردار ہیں، ان کے دل و دماغ میں یہ صلاحیت موجود ہے، کہ اگر وہ ازل اور ابد کی حقیقتوں کو دیکھنا چاہیں تو نور محمد و علی صلوات اللہ علیہما کی روشنی میں یہ سب کچھ دیکھ سکتے ہیں، کیونکہ ان کے سامنے اور پیچھے تقلید و جہالت کی کوئی دیوار نہیں، اور وہ پردہ غفلت میں ڈھانپے نہیں گئے ہیں۔

اب ہم اپنے اصل موضوع کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو جشنِ نوروز کے متعلق ہے، چنانچہ اگر ہم یہ عقیدہ رکھیں، کہ لاکھوں یا کروڑوں سال قبل یا

اس سے بھی بہت پہلے ایک زمانہ ایسا تھا، جس میں ہمارا یہ سیارہ زمین موجود نہیں ہوا تھا، پھر خدا کی قدرت سے یہ سیارہ پیدا ہوا تو لازماً ہمیں یہ بھی ماننا ہی پڑے گا کہ ہماری زمین کا کوئی آغاز و انجام ہے، پس جس روز سیارہ زمین پیدا ہوا ہو، وہ اسکا "نوروز" تھا، یعنی اس کمرہ ارض کی تخلیق و تکمیل کا پہلا دن ہی اس کی طویل عمر کا ابتدائی اور نیا دن تھا، کیونکہ نوروز دراصل وہی ہے، جس میں زمین کی تخلیق مکمل ہو کر اس کی مدتِ عمر کا پہلا دن شروع ہوا، جس میں پہلی دفعہ سورج رُوئے زمین پر چکنے لگا، پہلی بار سائے نمودار ہوئے، اور وہیں سے دن رات کا آغاز ہوا، وہ اس طرح کہ کمرہ ارض کے پیدا ہوتے ہی سورج کی جانب کے نصف کمرہ پر دھوپ پڑی اور دوسری جانب زمین کا اپنا سایہ پڑا، پس دھوپ کا نام دن اور سائے کا نام رات مقرر ہوا، اسی طرح بیک وقت دن اور رات کا آغاز ہوا۔

اسی نوروز کے دن زمین اپنے مدار پر مغرب سے مشرق کی طرف گردش کرنے لگی، اور وہیں سے شمسی اور قمری سال شروع ہوئے، اس اصول کے مطابق وہ ابتدائی نوروز اتوار کے دن ہونا چاہئے، کیونکہ دنوں کی گنتی کا آغاز تو اتوار ہی سے صحیح ہے، اور انبیاء و اولیاء کی تعلیمات سے بھی یہی ظاہر ہے کہ اتوار کے دن دنیا پیدا ہوئی ہے، نیز یہ کہ دونوں کے تعین اور ترتیب کے متعلق مذاہبِ عالم میں بھی کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا ہے، اور یہ واقعہ اس بات کی دلیل ہے کہ یقیناً شروع سے لے کر اب تک سات دنوں کے سلسلہ شمار میں کوئی غلطی اور فراموشی واقع نہیں ہوئی ہے، اور

شروع ہی سے ہفتے کے دنوں کی صحیح گنتی اور یادداشت کے لئے یہ ضروری نہیں کہ جس روز سیارہ زمین پیدا ہوا، تو اسی روز انسان بھی زمین پر آ گیا ہو، تاکہ یہ کہا جاسکے، کہ تمام باتیں انسانوں کی تواریخ کی یادداشت کے طور پر یہاں پہنچی ہیں، بلکہ اس بارے میں یہ باور کرنا لازمی ہے کہ حقائق کا براہ راست تعلق وحی والہام سے ہے، جو انبیاء و اولیاء (آئمتہ) علیہم السلام کے لئے مخصوص ہے۔

نیز بتا دیا جاتا ہے کہ جس وقت سیارہ زمین پیدا ہوا، تو وہ یہی نوروز کا دن تھا، جس میں سورج اور چاند دونوں بیک وقت برج حمل کے مقابل ہونے لگے تھے، اور اسی روز سب سے پہلی چاند رات گزری تھی، یہی سبب ہے کہ دور حقیقت کے آغاز ہی سے چاند رات اور آبِ شفا کی اہمیت و افادیت کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ دلائی جاتی ہے، کیونکہ قمری اور اسلامی حساب کے مطابق چاند رات وہ تاریخ ہے جس میں خداوند عالم نے رحوں سے توحید اور معرفت کا اقرار لیا، اور جس میں اکثر معجزات ظاہر ہوئے، چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ﴿۵۵﴾

”یعنی سورج اور چاند ایک ہی حساب رکھتے ہیں۔“

اس کا مطلب یہ ہوا کہ شمسی اور قمری سالوں کا حساب ایک ہی نقطے اور ایک ہی درجے (DEGREE) سے شروع ہوا ہے، یعنی جس روز سیارہ زمین پیدا ہوا، وہ نہ صرف سورج ہی کے حساب سے نوروز (یعنی نیادن) تھا

بلکہ چاند کے حساب سے بھی نوروز ہی تھا، کیونکہ مذکورہ بالا آیت کے مطابق سورج اور چاند کا ایک ہی حساب ہونے کے یہی معنی ہیں، کہ اس کہہ ارض کے شمسی اور قمری دونوں سال اسی طرح بیک وقت شروع ہوئے، جس طرح گھڑی کی گھنٹے والی سوئی اور منٹ والی سوئی دونوں بارہ کے ہند سے سے بیک وقت چلنے لگتی ہیں، اور ہر بارہ گھنٹے کے اختتام پر یہ دونوں اسی بارہ کے ہند سے پر یکجا ہوتی جاتی ہیں، اُس وقت ان دونوں سوئیوں کا جس طرح حساب ایک ہوتا ہے، اسی طرح اُن کا نقطہ روانگی (STARTING POINT) بھی ایک ہوتا ہے۔

اس مطلب کے بیان پر مزید روشنی ڈالنے کے لئے اس آیت کریمہ کی

حقیقتوں کو واضح کر دی جاتی ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ۳۶

اور سورج اپنے ٹھکانے کی طرف چلتا رہتا ہے، یہ اندازہ باندھا ہوا ہے اُس (خدا) کا جو زبردست علم والا ہے۔ سورج کی گردش سے زمین کی گردش مُراد ہے، اور سورج خود دراصل اپنے مقام پر ساکن ہی ہے، پس ظاہر ہے

کہ زمین ہی اپنے ٹھکانے کی طرف چلتی رہتی ہے، اور اس کا ٹھکانہ یہ ہے کہ جب زمین کے تمام باشندے مادی اور روحانی ترقی کے نتیجے پر فوری اجسام (فوری پیکر ASTRAL BODY) حاصل کئے ہوئے ہوں گے، یعنی جب ان کی حیات و بقا فلکی قسم کے جسموں میں منتقل ہوگی تو اُس وقت یہ زمین اپنے مدار سے ہٹ کر سورج سے دور ان بے شمار ستاروں میں شامل

ہوگی جو حاشیہ عالم کے قریب واقع ہیں، پھر یہ عجب نہیں کہ وہ سب سے عظیم واقعہ بھی نوروز اور چاند رات ہی کے موقع پر واقع ہو، چنانچہ پیرناضیر و (قدس اللہ سرہ) کی مشہور کتاب وجہ دین اور زاد المسافرین نیز سید سہراب کی کتاب صیغۃ الناظرین میں سیارہ زمین کے اٹھاٹھے جانے کا ذکر موجود ہے جب یہ معلوم ہوا کہ نوروز وہ دن ہے، جس میں پروردگار عالم نے روجوں سے اپنی یکتائی کا اقرار لیا ہے، جس میں حضرت نوح اور اس کے تابعین کو آخری نجات ملی ہے، جس میں حضرت ابراہیمؑ نے شاہی بتوں کو توڑا ہے، جس میں حضرت موسیٰؑ کو جادو گروں پر فتح دی گئی ہے، جس میں آنحضرت پر سب سے پہلی وحی نازل ہوئی، جس میں آنحضرتؐ اور ان کے وصی مولانا علیؑ نے خاندانِ خدا کو بتوں کے وجود کی ناپاکی سے پاک کر دیا، اور جس میں بمقام غدیر خم مولانا علیؑ کی ولایت و امامت کا اعلان ہوا، تو آئیے اس مبارک اور مقدس عید نوروز کے موقع پر ہم بھی اقرارِ الست کو تازہ کرتے ہوئے خدا کی معرفت کی طرف توجہ کریں، اپنے دلوں میں خود بینی اور دنیا پرستی کے جوہت پائے جاتے ہیں، ان کو توڑ ڈالیں، نفسانی خواہشات کے جادوؤں پر فتح حاصل کریں، اور کعبہ دل کو باطل خیالات کے بتوں سے پاک و صاف کر لیں، نیز یہ دیکھ لیا کریں، کہ امامِ حق و حاضر کے مبارک فرمان کے مطابق گزشتہ نوروز سے لے کر اس نوروز تک ہم نے کون کون سی قومی اور جماعتی خدمات انجام دی ہیں، اور آئندہ زیادہ سے زیادہ خدمات کس طرح کی جا سکتی ہیں، کیونکہ جشنِ نوروز عزم و عمل کا پیغام لاتا ہے۔

اتحاد المسلمین

مورخہ ۲۸- اکتوبر ۱۹۶۹ء کو سرکار مولانا شاہ کرمیم الحسینی حاضر امام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شادی مبارک کے پرسترت موقع پر مشاہد کرمیم الحسینی ہو سٹل، گلگت میں جناب فضیلت ماب موکھی سید کرم علی شاہ صاحب نائب صدر ہنزائل ہائٹنس پرنس آغا خان سپریم کونسل برائے ہونزہ، گلگت، چترال، اور سوطی ایٹیا کے زیر سرکردگی ایک جشن منعقد ہوا، جس کی صدارت گلگت و بلتستان کے ریز پڈنٹ راجہ حبیب الرحمن خان صاحب تعمیر پاکستان نے کی۔ اس موقع پر اس بندہ نے اتحاد المسلمین کے موضوع پر جو تقریر کی تھی اسکا اصل مضمون درج ذیل ہے:-

دین اسلام کے مختلف فرقوں کی مجموعی حیثیت ایک ایسے شردار درخت کی طرح ہے جس کی بہت سی شاخیں ہوں، ہر چند کہ درخت کی شاخیں فنا کے مختلف اطراف و جوانب میں ایک دوسرے سے جدا جدا ہوتی ہیں، تاہم وہ تنے کی صورت میں باہم ملی ہوئی ہوتی ہیں، بالکل اسی طرح اسلام کے تمام فرقے خدا واحد کے عقیدہ و وحدانیت، حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت اور اس کے ضمنی عقائد میں ایک دوسرے کے ساتھ متحر اور متفق ہیں، مگر یہ

فرقے اشخاصِ امامت و خلافت کے تعین کے بارے میں ایک دوسرے سے مختلف اور جدا جدا ہیں۔

اب متذکرہ بالا بیان سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آئی کہ دینِ اسلام کی مجموعی حیثیت کے اندر اگرچہ ایک طرف سے فروعی طور پر اختلاف پایا جاتا ہے، تاہم دوسری طرف سے اصولی طور پر اس کے اندر قوتِ اتحاد بھی کارفرما ہے، جس طرح ایک عظیم مشین کے اجزاء اپنی اپنی شکل و صورت میں مختلف اور جدا جدا ہوتے ہیں، مگر مشین اپنی مجموعی حیثیت میں ایک ہی ہوتی ہے، اور اس کے ایسے ہونے میں یہ حکمت مضمر ہے، کہ بہت سے ذیلی مقاصد کے حصول کے نتیجے پر ایک مقصدِ اعلیٰ حاصل کیا جاسکے، یہی مثالِ اسلام کے مختلف فرقوں کی بھی ہے، تاکہ اس فروعی اختلاف کی محرکات کے باعث علم و عمل کے میدان میں تقابلی جدیے سے کام لیتے ہوئے توحیدِ باری تعالیٰ کے عظیم اسرار کے نایاب خزانوں کا انکشاف کیا جاسکے، اور جس کے سلسلے میں اسلامی علم و ادب کے بے پایان اور گرانمایہ ذخائرِ ادیانِ عالم کے مقابلے میں پیش کئے جا سکیں۔

اب اس مقام پر پہنچ کر یہ امر ضروری معلوم ہوتا ہے، کہ نظریۂ امامت کی بھی کچھ وضاحت کی جائے، کیونکہ آج کی اس تقریبِ مسعود کا تعلق براہِ راست اسی نظر سے ہے، چنانچہ قبلاً یہ بیان ہو چکا ہے، کہ اسلام کے تمام فرقے اشخاصِ امامت و خلافت کے تعین کے بارے میں ایک دوسرے سے مختلف اور جدا جدا ہیں، اس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ، اسلام کا ہر فرقہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی نہ کسی صورت میں ایک امام یا خلیفہ کے ہونے کا قائل ہے، چنانچہ اسماعیلی فرقہ حضرت مولانا شاہ کریم الحسینی کو اپنا امام وقت مانتا ہے، اور اس سلسلے میں اس فرقے کا عقیدہ واضح یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے، بلکہ ازل سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک نور امامت پوشیدہ طور پر موجود تھا، اور آنحضرت صلعم کے زلزلے میں یہ نور حضرت مولانا مرتضیٰ علی علیہ السلام کے جائز بشریت میں ظاہر ہوا، پھر جناب مرتضیٰ شیر خدا اور حضرت فاطمہ الزہراء علیہما السلام کی آل اطہار کے سلسلے میں یہ نور جامہ بجامہ منتقل ہوتا چلا آیا ہے، کیونکہ خدائے واحد اور اس کے رسول برحق کی مرضی اسی میں تھی کہ دنیا اور زمانہ نور امامت کی مقدس ہدایت سے کبھی خالی نہ رہ جائے۔

اسماعیلی فرقے کے اعتقاد کے مطابق زمانے کا امام ہمیشہ دنیا میں حاضر اور موجود ہے، کیونکہ انسانی ہدایت کی ضرورت کے پیش نظر اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے میں اپنے اور مخلوق کے درمیان جو کچھ واسطہ اور وسیلہ مقرر فرمایا تھا، وہ ہمیشہ کے لئے موجود ہونا چاہئے، چنانچہ حق تعالیٰ نے ابتداء ہی میں فرشتوں سے فرمایا تھا کہ "اِنَّ جَاعِلًا فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً" میں رُوئے زمین پر ایک خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں، پس انسانی ہدایت کی ضرورت و اہمیت اس وقت بھی اسی طرح ہے، جس طرح کہ حضرت آدم کے زمانے میں تھی، یہی وجہ ہے کہ اسماعیلی اپنے امام زمان کو خلیفہ خدا، اور خلیفہ رسول مانتے ہیں، اور وہ امام عالی مقام کے مہر فرمان پر اسی لئے عمل پیرا ہوتے ہیں۔

اسماعیلی فرقے کا کلیدی عقیدہ یہ ہے، کہ خدا کی فرمانبرداری، رسول کی ہدایت کے مطابق کی جائے، اور رسول کی فرمانبرداری امام زمانہ کی ہدایت کے مطابق کی جائے، وہ اپنا اس نظر سے کی تصدیق میں اس آیت قرآنی کو پیش کرتے ہیں:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ
اور اولوالامر کی اطاعت کرو، جو تم میں سے (یعنی تمہارے درمیان) ہیں، پس اسماعیلی اولوالامر سے اپنے سلسلے کے تمام ائمہ مطہرین مراد لیتے ہیں، اور امام وقت کو صاحب امر مانتے ہیں۔ چنانچہ حضرت مولانا شاہ کریم الحسینی اسماعیلی جماعت کے امام زمان اور صاحب امر ہیں، جن کی عروسی مبارک کا جشن سعید آج کے دن اسماعیلی عالم میں انتہائی عقیدت و محبت سے منایا جا رہا ہے۔

اسماعیلیوں کے مذکورہ بالا عقائد کا سب سے آخری نتیجہ یہ نکلا، کہ وہ امام زمان کو رشد و ہدایت کا ایک ایسا عظیم مرکز مانتے ہیں، جس کو خدا اور رسول نے اس غرض سے قائم کر دیا ہے، کہ اس کے ذریعے سے اسلامی اخوت کے باہمی اختلافات ختم کئے جائیں، اور مسلمانان عالم کے درمیان صحیح معنوں میں اتفاق و اتحاد قائم رہے۔

آبِ شِفَاء

آبِ شِفَاء کے معنی ہیں تندرستی اور صحت یابی کا پانی، اور اس سے وہ تبرک پانی مراد ہے، جو امامِ زمانؑ کے قربانِ مبارک کے مطابق جماعتِ خانے میں بعض خاص موقعوں پر رُوح اور جسم کی صحت کی نیت سے پی لیا جاتا ہے، یا چہرے پر پھیر دیا جاتا ہے۔

لفظِ شِفَاء کی حکمت :

قرآن مجید کی حکمت میں شِفَاء کی تین قسمیں بتائی گئی ہیں، پہلی قسم کی شِفَاء عقلمانی ہے، جو حق تعالیٰ سے وحی و الہام کی صورت میں انبیاء اور ائمہ علیہم السلام کو حاصل ہے، دوسری قسم کی شِفَاء روحانی ہے، جو روحانی طبیوں یعنی پیغمبروں اور اماموں کے وسیلے سے ہدایت کی حیثیت میں مومنین کو حاصل ہوتی رہتی ہیں، اور تیسری قسم کی شِفَاء جسمانی ہے، جو جسمانی طبیوں کے ذریعے مختلف دواؤں کی حیثیت میں عوام الناس کو ملتی ہے، چنانچہ قرآن کی وہ حکمت ذیل کی طرح ہے:-

عقلمانی شِفَاء :

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے (جو نبوت اور امامت دونوں کی بہترین مثال تھے) فرمایا، اور جب میں بیمار ہو جاؤں، تو وہی (یعنی خدا) مجھے شفا دیتا

ہے ۲۶ ” انسانی وجود میں چیزوں کا مجموعہ ہے، عقل، رُوح، اور جسم، اور تینوں میں عقل اعلیٰ و افضل ہے، اس کے بعد رُوح کا درجہ ہے، اور اس کے بعد جسم کا مقام، ان تینوں میں سے ہر ایک کو اپنی نوعیت کی بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں، پس معلوم ہوا کہ جو شفا حق تعالیٰ سے بلا واسطہ حضرت ابراہیمؑ کو حاصل تھی، وہ عقلانی قسم کی شفاء تھی، کیونکہ انسانِ کامل پر اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا فضل و احسان یہ ہے، کہ خدا سے عقلی نعمتوں سے نوازتا ہے۔

روحانی شفاء :

دوسری قسم کی شفاء روحانی ہے، جو پیغمبر یا آنحضرتؐ کے جانشینؑ (یعنی امامِ زمانؑ) کے وسیلے سے ہمیشہ نصیحت و ہدایت کی صورت میں مومنین کو ملتی ہے، چنانچہ مومنین کی روحانی تارکیاں اور تکلیفیں بیماریوں کی مثال ہیں، ان سے چھڑکارا پانے کی ہدایات دواؤں کی طرح ہیں، اور زلمنے کا ہادی طبیب کی مانند ہیں، جیسا کہ قرآن کا ارشاد ہے: ”اور ہم قرآن میں وہ چیز نازل کرتے ہیں جو مومنین کے لئے شفاء اور رحمت ہے (مگر) نافرمانوں کو تو گھاٹے کے سوا کچھ بڑھاتا ہی نہیں“ ۲۷

اب معلوم ہوا کہ قرآن میں وہ شفا بخش چیزیں ہیں جن کے ذریعہ صرف مومنین ہی کو روحانی بیماریوں سے شفا مل سکتی ہے، پس ظاہر ہوا کہ قرآن روحانی دواخانہ اور شفاخانہ ہے، اور انسانِ کامل یعنی پیغمبرؐ اور امامِ زمانؑ روحانی طبیب ہیں، تاکہ ہر زمانہ اور ہر جگہ کے مومنین کے ہر درد و سوج کی دوا اور شفا میسر ہوگی،

جسمانی شفاء:

حق تعالیٰ نے قرآن مجید کی حکمت میں نہ صرف عقلانی و روحانی شفاء کا بیان فرمایا ہے، بلکہ ایک بہترین مثال میں جسمانی شفاء کا بھی ذکر فرمایا ہے، تاکہ ہر دانش مند کو یہ معلوم ہو کہ لفظ شفاء کی مثال اور حکمت میں شفاء سے متعلق تمام چیزوں کا بیان ہے، یعنی شفاء کے لفظ میں دوا کی طرف بھی اشارہ ہے، اور طبیب کی طرف بھی، کیونکہ دوا تشخیص کے بعد تجویز کی جاسکتی ہے، اور کسی بیماری کی تشخیص صرف طبیب ہی کر سکتا ہے، پس روحانی اور عقلانی شفاء کا بھی یہی حال ہے، چنانچہ جسمانی شفاء کے متعلق ارشاد ہے ”شہد کی مکھڑوں کے پیٹوں سے ایک مشروب بن کر نکلتا ہے، جس کے رنگ مختلف ہوتے ہیں، اس میں لوگوں کے لئے شفاء ہے، یقیناً اس میں غور و فکر کرنے والوں کے لئے ایک نشانی ہے“ ۱۶ اور اس نشانی کا ایک پہلو یہ ہے، کہ اگرچہ شہد کو کھا لینا سب جانتے ہیں، لیکن صرف طبیب ہی کسی مریض کو اس کا صحیح نسخہ بتا سکتا ہے، اسی طرح جہاں قرآن پاک کے ساتھ ساتھ روحانی شفاء نازل ہوئی ہے اس کا تعلق روحانی طبیب سے ہے۔

آبِ شفاء کی برکات:

امام زمانؑ آبِ شفاء کے کسی ایک جزو پر بطور خاص مذکورہ تین قسم کی شفاؤں کے لئے دعائے برکات فرماتے ہیں، اس کے علاوہ جماعت خانہ کے فیوض بھی اس

میں شامل ہیں، نیز موکھی کامٹریا اور تمام مومنین اس تبرک سے فیض و برکت حاصل کرنے کے لئے یکجا طور پر نیت کرتے اور دُعا مانگتے ہیں، اور ہر مومن انتہائی عاجزی، خلوص، اور یقین کے ساتھ آبِ شفا پیتا ہے، پس ان تمام دُعاؤں کے بعد آبِ شفاء پُر اثر اور معجز نما ہو جاتا ہے۔

رُوحانی طبیب کی شان :

جسمانی طبیب کی صرف یہی خوبی ہے، کہ وہ بہت سی بیماریوں کے لئے بہت سے نسخے تیار کر سکتا ہے، مگر روحانی طبیب یعنی امام زمان کی یہ شان ہے کہ وہ ایک ایسا جامع ترین اور کامل ترین نسخہ بتاتا ہے جو تمام بیماریوں کے لئے کافی اور شافی ہوتا ہے، اور وہ نسخہ یہ ہے کہ مومنین مقررہ اوقات پر جماعتِ خانہ میں حاضر ہو کر مقررہ عبادت بجالائیں اور آبِ شفاء سے استفادہ کریں، کیونکہ جسمانی بیماریاں درحقیقت رُوحانی بیماریوں سے پیدا ہوتی ہیں، اور رُوحانی بیماریوں کی جڑ غفلت ہے، یعنی خدا کی یاد بھول جانا، جیسا کہ قرآن مجید کا ارشاد ہے :-

”اور اس کا کہنا نہ مانو جس کے دل کو ہم نے اپنے ذکر سے غافل پایا ہے، اور اس نے اپنی ہی خواہش کی پیروی کی ہوئی ہے، اور اس کا معاملہ حد سے گزر گیا ہے، ۱۸“ یعنی راہِ راست کی ہدایت خدا کی یاد ہی میں تھی، جب اُس نے ذکر چھوڑا تو اسی وقت راہِ راست سے بھٹک گیا، اور اپنی خواہش ہی کے پیچھے غلط راستے پر چلنے لگا، اب اس غلط راستے پر پہلے روحانی بیماریاں

اور پھر جسمانی بیماریاں ستانے لگتی ہیں۔

آبِ شِفاءِ کا معجزہ :

معجزہ ڈو طرح سے ظاہر ہو جاتا ہے، ایک معجزہ وہ ہے جو خدا کی مرضی سے عوالم و خواص سب پر واقع ہوتا ہے، دوسرا معجزہ وہ ہے جس کا تعلق صرف خواص ہی سے ہے، جس کی شرط یقین اور عمل ہے، پس آبِ شفاء کا اثر ایک ایسا معجزہ ہے، جس کی شرط یقینِ کامل اور عملِ صالح ہے، چنانچہ آبِ شفاء شروع شروع میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضراتِ اہلبیت کے لئے استعمال فرمایا، جو معجزانہ طور پر اثر انداز ہوتا تھا، جس کی ایک مثال یہ ہے، کہ جب حضرت امام حسین علیہ السلام بچپن کے زمانہ میں سخت بیمار ہوئے تو رسول اللہ صلعم نے ان پر آبِ شفاء چھڑک دیا، اور امام حسین علیہ السلام فوراً صحت یاب ہو گئے۔

Luminous Science
Knowledge for a united humanity

عقیدت و محبت کا تقاضا:

مومنین امام زمان علیہ السلام سے جو عقیدت و محبت رکھتے ہیں، اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ امام عالی مقام ان پر باطنی طور سے درستی و رحمت رکھیں، اس کے علاوہ ظاہر میں بھی ان کو بار بار اپنے پاک دیدار سے نواز کریں، ان کے سر اور کندھوں پر درستی و شفقت رکھیں، انہیں اپنے مبارک ہاتھ سے تبرکات عطا فرمائیں، اور ساتھ ہی ساتھ کچھ ایسے تحائف بھی عنایت کریں کہ ان تحفوں اور مہربانیوں کی وجہ سے خداوندِ عالمین کی یہ نعمتِ عظمیٰ بار بار

یاد آئے، اور وہ ہر وقت شکر گزار ہیں کہ راہِ راست کی ہدایت
 کرنے کے لئے امامِ حجتی و حاضران کے درمیان موجود ہیں، پس ان
 تمام مقاصد کے حصول کے لئے جماعتِ خانہ کے آداب و تہذیبات مقرر ہوئے
 اور اب شفا اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔



**Institute for
 Spiritual Wisdom
 and
 Luminous Science**
 Knowledge for a united humanity

CROWN



تاج

MONOGRAM



تاج

اسماعیلی تاج و طغرا

ہم یہاں (انشاء اللہ تعالیٰ) اسماعیلوے تاج و طغرا کے متعلق چند اصولیہ حقیقتوں کا انکشاف کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ اسماعیلوے تاج و طغرا سامنے دسٹے ہوئے نقشے کی طرح ہے۔

تاج:

اس کُرۃ ارض کی سطح پر صرف اسماعیلی تاج ہی ایک ایسا تاج ہے، جو حقیقی اسلام اور روحانی نظام کے دائمی وجود کی نشاندہی کرتا ہے، اور یہ اُس دینی اور روحانی سلطنت کا تاج ہے جس کے متعلق قرآن مجید کا یہ ارشاد ہے:

”فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُم مِّنْكَ عَظِيمًا ۝ ۲۴ سُوْرَةُ ۲۱-۵۴“
 اور حکمت (اور اس کی وراثت) دی ہے، اور ان کو ایک عظیم سلطنت دی ہے؛
 اس آئیۃ مقدسہ کی ترتیب میں کتاب کے بعد حکمت کا ذکر آیا ہے، اور اسکے
 بعد ملک عظیم یعنی روحانی سلطنت کا ذکر آیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک

دنیا میں آسمانی کتاب موجود ہے، تب تک اس کے باطن میں حکمت کے پوشیدہ خزانے بھی موجود ہیں، اور جب تک اس کتاب سے حکمت کے پوشیدہ خزانے پائے جاسکتے ہیں تب تک آلِ ابراہیم یعنی آلِ محمدؐ کا سلسلہ بھی جاری اور باقی ہے، تاکہ اسی سلسلے کے ذریعے سے ہرگز وہ اور ہر فرد کو اس کی حقاری کے مطابق کتاب و حکمت سے ہدایت دی جاسکے، اور یہی خصوصیت اس سلسلے کی آسمانی سلطنت کی دلیل ہے۔

اس بیان سے جب یہ حقیقت ثابت ہوئی کہ روحانی سلطنت آلِ ابراہیم یعنی آلِ محمدؐ ہی کو حاصل ہے، تو اب ہم اسماعیلی تاج و طغرا کا بیان کرتے ہیں، چنانچہ اسماعیلی تاج کا دایاں چشمہ درجہ نبوت کی علامت ہے، اور بائیں چشمہ درجہ امامت کی نشانی ہے، اور یہ تاویل دورِ نبوت کی نسبت سے ہے، جس میں آنحضرتؐ جسمانی طور پر موجود تھے، مگر دورِ امامت کے اعتبار سے، جو رسولؐ خدا کی رحلت کے بعد سے شروع ہوا، دایاں چشمہ مرتبہ امامت کی علامت ہے، اور بائیں چشمہ مرتبہ نبوتی، یعنی پیغمبری کی نشانی ہے، نیز دایاں چشمہ قرآن کے ظاہری علم کی طرف اشارہ ہے جو پیغمبرؐ کا حصہ ہے، اور بائیں چشمہ قرآن کی حکمت کی طرف اشارہ ہے، جو امام کا حصہ ہے۔ تاج کے دائیں چشمہ کا دامن بہت مختصر اور تاج کے نچلے کنارے سے بلند

۱۹۱، ۱۹۲۔ نینرو جیر دین حصہ دوم ص ۲۳۔
 ۱۹۰۔ دائیں اور بائیں کی تاویل کے لئے دیکھئے: کتاب ”ویر دین حصہ اول“ ص ۱۹۰۔

دور ہے، اس کے برعکس بائیں چشمے کا دامن تقریباً تاج کے نچلے کنارے تک پہنچا ہوا ہے، اس کا مطلب یہ ہے، کہ زمانہ نبوت ۲۳ سال کا ایک مختصر وقت تھا، مگر دور امامت قیامت تک چل رہا ہے، پس اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں، کہ پیغمبر تک رسا ہو جانے کے لئے امام وقت کی فرمانبرداری کی جائے۔

تاج کا طرہ دونوں چشموں کے درمیان سے نکل کر بائیں جانب کو مائل ہوتے ہوئے بلند ہوا ہے، یہ نور ہدایت کا نشان ہے، جو حضرت محمد (پیغمبر) اور حضرت مولانا علیؑ (امام) کا واحد نور ہے، اور اس طرہ کے بائیں جانب مائل ہونے کے یہ معنی ہیں، کہ نور ہدایت سے مستفیض ہونے کے لئے پہلے

امام کی معرفت حاصل کی جائے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے،
 ”إِنَّمَا آنتَ مُنذِرٌ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ“ (سورہ دے رسول) سوائے
 اس کے کچھ نہیں، کہ آپ صرف ڈرانے کے ذمہ دار ہیں، اور ہر قوم (یعنی ہر زمانہ کے لوگوں) کے لئے ایک ہادی ہوا کرتا ہے؟

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اگرچہ نور ہدایت پیغمبر اور امام کے درمیان مشترک ہے، تاہم اس کا زیادہ تر تعلق امام کی شخصیت کے ساتھ ہے، کیونکہ امام سرچشمہ ہدایت کی حیثیت سے ہر وقت حاضر اور موجود ہیں۔

نیز اس طرہ کے بائیں جانب مائل ہونے کے یہ معنی ہیں، کہ ہادی بہ حق (یعنی امام زمان) کی تفصیلی معرفت کے لئے محبت (پیر) کی طرف رجوع کیا جائے، کیونکہ پیر اور معلم کی تعلیم کے بغیر امام زمان کی معرفت انتہائی مشکل ہے، اس سے قبل بتایا گیا ہے، کہ دور نبوت میں دائیں طرف کا درجہ پیغمبر

کے لئے ہے، اور بائیں جانب کا درجہ امام زمانہ کے لئے ہے، اس کے عکس
دور امامت میں امام کا مرتبہ دائیں جانب ہے، اور پیر کا رتبہ بائیں طرف ہے۔

طغرا:

اسماعیلی طغرا میں سب سے پہلے حلال (CRESCENT) آتا ہے،
ہلال ترقی و تکمیل کا اشارہ ہے، چنانچہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے وقت
میں عالم دین کے سورج تھے، اور امام علیہ السلام اس زمانے میں آنحضرت کے
وزیر کی حیثیت سے دین کے چاند تھے، مگر امام اپنے زمانے میں عالم دین
کے سورج ہیں اور پیر (یعنی حجت اعظم) دین کے چاند ہیں، جس کا مطلب
یہ ہے کہ پیغمبر اسلام کی رحلت کے بعد امام زمانہ نور کے مرکز یعنی عالم دین کے
سورج ہیں، جس کے نور میں کوئی کمی و بیشی نہیں ہوتی، مگر حجت اعظم کے نور
میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، کیونکہ وہ چاند کی طرح ہیں۔

نیز اس ہلال کی تاویل یہ بتاتی ہے کہ اسماعیلی مذہب میں روحانی ترقی و
تکمیل از بس ممکن ہے، اور وہ دو طرح سے ہے؛ ایک روحانی ترقی انفرادی طور
پر ہے، جو ہر زمانے میں کی جاسکتی ہے، اور اس کا دار و مدار ہر مومن کی اپنی
کوشش پر ہے، دوسری روحانی ترقی اجتماعی حیثیت میں ہے، جس کے لئے
ایک خاص وقت آنیوالا ہے۔

چنانچہ ہلال میں انفرادی ترقی کی مثال یہ ہے، کہ ہر حقیقی مومن کو پیر کا
علم اور امامت کی معرفت ایک دن میں نہیں آتی، بلکہ آہستہ آہستہ حاصل ہو

سکتی ہے، یعنی جب کوئی مخلص مومن امام زمان کی فرمانبرداری کرتے کرتے روحانی طور پر نور دیکھنے کے قابل ہو جاتا ہے تو شروع شروع میں اس کو صرف اتنا ہی نور دکھایا جاتا ہے جتنا کہ نئے چاند سے حاصل ہو سکتا ہے، اسی طرح مومن کے روحانی مشاہدہ میں نور دن بدن بڑھتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ چودھویں کے چاند کی مانند اور اس کے بعد سورج کی طرح ہو کر نور مکمل ہوتا ہے، جیسا کہ قرآن کے اس ارشاد سے یہی حقیقت ظاہر ہے۔

”رَبِّنَا اٰتَمْنَا نُوْرًا وَاَعْفَرْنَا ۗ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ“

۶۶۔ اے ہمارے پروردگار! تو ہمارے لئے ہمارا نور کامل کر دے، اور ہمیں

بخش دے، تو ہر چیز پر پوری پوری قدرت رکھنے والا ہے۔“

اس طغرا کے ہلال پر دائیں طرف پانچ اور بائیں طرف پانچ کل دس موتی

ہیں، جن کی مراد دین کے دس مرتبے ہیں جو پانچ روحانی اور پانچ جسمانی ہیں، پانچ روحانی مرتبے: عقل کل، نفس کل، اسرافیل، میکائیل اور جبرائیل ہیں، اور پانچ جسمانی مرتبے: ناطق (محمد) اساس (علی) امام، محبت اور داعی ہیں۔

اس طغرا کے نیچے ایک ستون ہے، جس پر پانچ موتی دکھائی دے رہے

ہیں، جس کا اشارہ ولایت کی طرف ہے، جو شیعت کا مرکزی ستون ہے۔

اور وہ پانچ موتی پنجتن پاک کی نشاندہی کرتے ہیں، جن سے دوستی و محبت

رکھنا ولایت کی اصل بنیاد ہے، یعنی ولایت کا عقیدہ انہی حضرات کے

عصمت و نورانیت کے اقرار سے شروع ہوتا ہے، چنانچہ خداوند تعالیٰ کا

ارشاد گرامی ہے:

• قُلْ لَوْلَا أَسَأَلْتُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ ۗ ^{سورۃ ۲۳-۲۲}
 (اے رسول!) کہہ دیجئے، کہ میں اس (تبلیغ رسالت) پر کچھ نہیں مانگتا، سوائے اس
 کے، کہ میرے اقرباء سے محبت کرو۔“

طغرا کے اوپر کا حصہ موتیوں کے ایک ہار کی طرح ہے، جس میں ایک سہ پہلو لعل کا
 نقشہ دیا ہوا ہے، یہ موتیوں کا ہار سلسلہ امامت کی مثال ہے، جو ظاہرِ حضرت
 محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے سے لے کر قیامت تک چل رہا ہے، اور
 وہ سہ پہلو لعل ایک ایسے روحانی خزانے کی نشانی ہے، جو امام زمان کی نورانی
 معرفت کے بعد حاصل ہو سکتا ہے، جس میں عقل، رُوح، اور جسم کی تمام
 حقیقتیں اور قیامت کی ساری معرفتیں موجود پائی جاتی ہیں، چنانچہ ارشاد ہے:
 ”وَكُلُّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُّبِينٍ ۝ ^{۳۱۱}۔ اور ہم نے ہر چیز
 (یعنی عقلانی، روحانی، اور جسمانی حقیقتوں اور معرفتوں کو) امامِ ظاہر (یعنی
 امامِ ناطق) کی ذات میں مجموع و ملفوف کر رکھا ہے۔“

جس طرح اس ہار کے موتیوں میں کثرت اور اس کے رشتے (دھاگے) میں
 وحدت ہے، یعنی موقی تو بہت سے ہیں، مگر اس کا رشتہ اپنی ذات میں ایک
 ہی ہے، جس نے تمام موتیوں کو متحرک کر لیا ہے، اسی طرح نورِ امامت کی شخصیتوں
 میں کثرت پائی جاتی ہے، لیکن نورِ اپنی ذات میں ایک ہی ہے، اور اس میں
 کوئی کثرت نہیں، اور کثیر چیزوں کو ایک کر لینا اس کی خاصیت ہے، اس
 لئے اُس نے امامت کی تمام شخصیتوں کو ایک کر لیا ہے۔

اس بار کا رشتہ یعنی دھاگہ خدا کی رستی کی مثال ہے، جو نورِ امامت کی صورت میں ہے، اور اس کے موقی جیسا کہ ذکر ہوا، اشخاصِ امامت کی مثال ہیں جو سبکِ نور یعنی نور کے دھاگے میں پروئے ہوئے ہیں، اور یہ خدا کی رستی ہر وقت عالمِ علوی اور عالمِ سفلی کے درمیان اپنی گولائی میں گردش کرتی رہتی ہیں، جس میں نور کے مختلف جامے دنیا میں آتے اور دنیا سے گزرتے رہتے ہیں، تاکہ اپنے وقت کے جامہٴ نور (یعنی امامؑ) سے وابستہ ہو کہ بہت سی ارواح دنیا میں آسکیں، اور آخرت کی منزلِ نجات میں پہنچ سکیں، چنانچہ اسی معنی میں یہ ارشاد ہے:-

”وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ۗ سُوْرَةُ ۱۰۳-۳ اور تم سب لوگ اللہ تعالیٰ کی رستی کو مضبوط پکڑے رہو۔“

اسماعیلی تاج و طغرا کی شکل اور بناوٹ میں دین کی بہت سی اصولی حقیقتیں سمو دی گئی ہیں، امام زمانؑ کی رحمت و مہربانی سے یہاں چند ضروری حقیقتوں کی وضاحت کی گئی۔ والسلام۔

اسما علی پر ہم

پر ہم کو عربی زبان میں ”علم“ کہتے ہیں، اور علم کے لغوی معنی ہیں نشان، جھنڈا (علم) کو نشان کے معنی دینا اس لئے صحیح اور درست سمجھا گیا ہے، کہ یہ اپنے ایک خاص رنگ یا جداگانہ علامتوں سے جو اس پر بنائی ہوئی ہوتی ہیں، کچھ مخصوص معنی مطالب کو ظاہر کرتا ہے، مثلاً ظاہری اور عام رواج کے مطابق سُرخ رنگ کا جھنڈا خطرہ، انقلاب اور جنگ جیسے حالات کی طرف اشارہ کرتا ہے، اور سفید رنگ کا جھنڈا صلح، امن اور سلامتی کی نشاندہی کرتا ہے۔

چنانچہ ہر مذہب، ہر قوم اور ہر حکومت نے اپنے جھنڈے کے تعین کے سلسلے میں اپنے نظریے کے مطابق ایک جداگانہ رنگ اور کچھ مخصوص علامتوں کا انتخاب کیا ہے، تاکہ اس رنگ اور ان علامتوں سے اس مذہب یا قوم یا حکومت کے خاص مقصد اور نصب العین کی ترجمانی ہو سکے، اب ہم ذیل میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقدس جھنڈوں کے متعلق کچھ روایات درج کرتے ہیں:-

جابر کہتا ہے کہ رسول اللہ صلعم ایک سفید جھنڈے کے ساتھ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے، اس کے معنی ظاہر ہیں، کہ آنحضرت صلعم مکہ والوں کے لئے ہر طرح کی صلح و صلاح، اور ہر قسم کا امن و سلامتی لے کر تشریف لائے تھے۔

ابن عباس کہتا ہے، کہ حضور اکرم صلعم کے دو جھنڈے تھے، ایک بڑا جھنڈا جو سیاہ رنگ کا تھا، اور دوسرا چھوٹا جھنڈا جو سفید رنگ کا تھا، جس کا واضح اشارہ یہ ہے کہ اس مادی دنیا میں مومنین کے لئے دکھ زیادہ اور سکھ کم ہے، یا یوں کہنا چاہئے کہ یہاں نمگینی کے مقابلے میں خوشی برائے نام ہے۔

انسراء ابن عازب سے روایت ہے کہ رسول اللہ کا ایک سیاہ چوکور جھنڈا تھا، جس پر مختلف رنگ کے دھبے بنائے ہوئے تھے، اس کے معنی یہ ہیں کہ دین اسلام کی رواداری اور رسول برحق کے اخلاقِ حسنہ نے امت کے مجاہدوں کو اس صورتِ حال کے باوجود ایک کر لیا تھا، کہ وہ رنگ، نسل، زبان اور رسم و رواج کے لحاظ سے جدا جدا اور مختلف تھے۔

نیز یہ بھی کہا جاتا ہے کہ استنبول کی قدیم مقدس یادگار چمنیوں میں جناب رسالت مآب کا ایک خاص جھنڈا اب تک محفوظ ہے، یہ مقدس و متبرک جھنڈا صرف خاص خاص موقعوں پر دکھایا کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ یہ رسول اللہ کا قدیم ترین جھنڈا ہے۔

اس متبرک جھنڈے کی کیفیت کے بارے میں موجودہ دور کے ایک صاحبِ قلم کا کہنا ہے، کہ یہ پرچم چار مختلف رنگوں پر مشتمل ہے، سب سے اوپر کے حصے کا رنگ سبز ہے، اس کا مطلب یہ ہوا، کہ حضور اکرم صلعم نے اس جھنڈے کا تعین کرتے وقت تمام رنگوں میں سے بلحاظِ معنی چار کو منتخب فرمایا، اور پھر سبز رنگ کو ان منتخب شدہ رنگوں پر یا عتبارِ حکمت فوقیت و ترجیح دی۔

حضرت مولانا امام سلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ کے ایک ارشادِ گرامی سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا جھنڈے کے چار رنگوں کی ترتیب و ترکیب میں سبز رنگ کو فوقیت دینے کے علاوہ پیغمبرِ اسلامؐ ایک خالص سبز رنگ کا جھنڈا بھی رکھتے تھے، پس یہی سبب ہے کہ خاندانِ بنی فاطمہؑ نے شروع ہی سے اپنے جھنڈے کے لئے اسی سبز رنگ کا انتخاب کیا، جو حضورِ انورؐ کے نزدیک معنی خیز اور پر حکمت تھا، مگر یاد رہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے عظیم واقعہ کے بعد پیغمبر کے سبز رنگ کے ساتھ سُرخ رنگ کو بھی یادگار اور تاویل کے طور پر تسلیم کیا گیا، پس اس صورت میں سبز رنگ کا اشارہ پیر کی شناخت ہے، اور سُرخ رنگ کا ایسا اشارہ کی معرفت ہے۔

اب یہ سوال خود بخود سامنے آتا ہے کہ اگر تمام خاص و عام جھنڈوں کے رنگوں اور علامتوں کے کچھ مخصوص معنی ہوتے ہیں، تو پھر اسماعیلی جھنڈے کے اس سبز اور سُرخ رنگ میں کیا کیا اشارے پوشیدہ ہیں؟ نیز سبز اور سُرخ رنگ کی تفصیلت کی کیا دلیل ہے؟ اس کا جواب پیر حکیم نامہ خسرو قدس اللہ سرہ کے قول کے مطابق یہ ہے کہ سبز رنگ کے معنی ہیں پیغمبر اور امامِ زمان کے فرمان پر عمل کرتے ہوئے دین اور دنیا کو آباد کرنا، اور یقیناً دونوں جہان کا آباد ہونا، اور محمد و علی کے نور سے جو امامِ زمان کی حیثیت سے حاضر ہے، حقیقی رُوح حاصل کر کے زندہ جاوید ہو جانا، اور سُرخ رنگ کے معنی ہیں، ظاہری اور باطنی خطروں سے بچاؤ کرتے

ہوئے رُوحانی اور جسمانی ترقی کے لئے جدوجہد کرنا، یا کہ اپنے نفس کے خلاف
 جہاد کرنا، اور اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے قربانیاں پیش کرنا وغیرہ۔
 سبز اور سُرخ رنگ کی برتری و افضلیت پر قرآنی دلیل یہ ہے کہ سورۃ
 رحمن میں بطریق حکمت ان دونوں رنگوں کی خاص تعریف کی گئی ہے، اور
 سورۃ رحمن کا دوسرا نام "عروس القرآن" ہے، کیونکہ حق تعالیٰ نے اس سورہ
 کو ظاہری و باطنی حسن و جمال سے آراستہ و پیراستہ فرمایا ہے، چنانچہ اس
 سورۃ میں یاقوت اور مسرجان کے لفظوں میں سُرخ رنگ کی تعریف کی
 گئی ہے۔ اور مُدھامتان اور خضرمیں سبز رنگ کی تعریف ہے،
 پس ظاہر ہے کہ الفاظ و معانی کی اس عروسِ زیبا کو سجانے میں خدائے حکیم نے
 بھی رنگوں سے کام لیا ہے، وہی رنگ دوسرے تمام رنگوں سے احسن و افضل ہے
 ان دونوں رنگوں کی افضلیت پر عقلی دلیل یہ ہے کہ اس عظیم کائنات میں
 جو کچھ ہے، اس کے تین درجے ہیں، سب سے نیچے درجہ عبادات ہے جس
 میں بے جان چیزیں ہیں، اس سے اوپر درجہ نباتات ہے، جس میں اُگنے
 اور نشوونما پانے والی اشیاء ہیں، اور اس کے اوپر درجہ حیوانات ہے
 جس میں تمام جاندار مخلوق شامل ہیں، چنانچہ مذکورہ بالا تین درجوں کی چیزوں
 کی ترقی و عروج کے سلسلے میں قانونِ فطرت کا اہل فیصلہ یہی ہے، کہ جب
 بے جان چیزیں رُوحِ نباتی قبول کر لیتی ہیں، تو قانونِ قدرت ان کو سبز
 رنگ کی خلعت سے نوازتا ہے، اور جب نباتات رُوحِ حیوانی کی قدا
 بن جاتی ہے، تو ان کو قانونِ الہی جانوروں یا انسانوں کی ہستی میں سُرخ

رنگ (یعنی خون) سے مزین کر کے جس و حرکت اور فہم و شعور کی زندگی عطا کر دیتا ہے۔

بیان بالا سے صاف طور پر ظاہر ہوا کہ اسماعیلی جھنڈا اپنے تاریخی پس منظر میں بھی اور اپنی موجودہ صورت میں بھی قانونِ فطرت کے عین مطابق ہے، یعنی یہ شروع میں بسز تھا، پھر اس میں سُرخ رنگ کا بھی اضافہ ہوا جیسے شاہراہ زندگی کی پہلی منزل پر بسز رنگ کی نباتات واقع ہیں، اور دوسری منزل پر سُرخ خون والے حیوانات، جن کی بہترین صورت انسان ہیں، پس اسماعیلی جھنڈا یہ مثال پیش کرتے ہوئے، کہ کس طرح مادّی زندگی منزل بہ منزل آگے بڑھتی جاتی ہے، رُوحانی زندگی اور اس میں ترقی حاصل کرنے کی تعلیم دیتا ہے، اور یہی تعلیم اس آیتِ کریمہ میں ہے کہ:

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِاللهِ وَارْتَمُوا بِأَعْقَابِكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ“ - اے وہ لوگو! جو ایمان لا چکے ہو، جس وقت رسول تمہیں ایسی بات کی طرف بلائے، جو تم کو زندہ کرے تو اللہ اور اس کے رسول کا کہا مانو: اس آیتِ مقدسہ کی حکمت کا اشارہ یہ ہے کہ عوامِ اناس عالمِ دین کے جمادات ہیں جن کو اس خاص قول و عمل کی طرف دعوت دیا جاتی ہے، جس میں ان کے لئے حقیقی رُوح اور ابدی حیات پوشیدہ ہے، پس اگر وہ اس دعوت کو قبول کریں تو رُوحانی طور پر ان کو سب سے پہلے نباتات کے درجے میں زندہ کیا جائے گا، پھر ان کو مقامِ حیوانیت سے آگے گزارتے ہوئے عالمِ دین کے انسانی رتبے تک پہنچا دیا جائے گا، جس کے لئے دو چیزیں ضروری اور لازمی ہیں، پہلی

چیز فرما برداری ہے، اور دوسری قربانی، فرمانبرداری اور قربانی میں یہ فرق ہے، کہ ہر فرمانبرداری قربانی نہیں، مگر ہر قربانی فرمانبرداری ہے، چنانچہ اسماعیلی جھنڈے کے سبز رنگ سے فرمانبرداری مطلوب ہے، اور سُرخ رنگ سے قربانی مُراد ہے۔

فرمانبرداری تین قسم کی ہوا کرتی ہے :

۱۔ عقلی اور روحانی طور پر۔

۲۔ جسمانی اعتبار سے۔

۳۔ مالی لحاظ سے۔

اسی طرح قربانی بھی تین قسم کی ہے :

۱۔ عقل و نفس کی قربانی۔

۲۔ جسم کی قربانی۔

۳۔ مال کی قربانی۔

دین حقیقی مومنین سے بحیثیتِ مجموعی یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے اکثر اوقات کو امامِ حجتی و حاضر کی فرمانبرداری میں گزاریں، اور قربانی صرف بوقتِ ضرورت دیا کریں، یہی سبب ہے کہ ہمارے مقدس پرچم کا سبز حصہ زیادہ اور سُرخ حصہ کم ہے۔

نیز اس مبارک پرچم کے سُرخ رنگ کا اشارہ یہ بھی ہے کہ مومن کو حقیقی زندگی شاہراہِ صراطِ استقیم پر چلنے ہی سے مل سکتی ہے، اور ساتھ ہی ساتھ اس کا دین بھی آباد ہو جاتا ہے، اور دنیا بھی، جیسے سُرخ رنگ حقیقی

زندگی کی نشاندہی کرتا ہے، کیونکہ یہاں سُرخ رنگ کا ایک راستے کی شکل میں ہونا صراطِ مستقیم اور اس پر چلنے کی مثال یہ ہے، اور اس کے دونوں طرف کا سبز رنگ حقیقی مومنین کے دونوں جہان آباد ہونے کی علامت ہے۔

پرچم کا یہ سُرخ راستہ (یعنی پٹی) پھر یہ سے کے اس نچلے کونے سے شروع ہو جاتا ہے، جو کبھی سے دُور ہے، پھر یہ راستہ بتدریج ڈنڈے کی طرف قریب سے قریب تر ہوتا جاتا ہے، یہاں تک کہ اخیر میں ستون سے جا ملتا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ حقیقی مومنین صراطِ مستقیم پر چلنے آگے بڑھ سکیں، اتنے امامِ حق و حاضر کے نور سے قریب تر ہوتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ وہ نورِ امامت سے واصل ہو جاتے ہیں، اور یہی وہ نور ہے، جس پر دین و دنیا کا قیام ہے، جیسے پرچم کا قیام و اقرار اس کے ستون پر ہے۔

توضیحات و حوالہ جات

۱۔ ۲۔ ۳۔ کہے ہے۔ ڈکٹری آف اسلام۔

۴۔ حضرت مولانا امام سلطان محمد شاہ علیہ السلام کا ایک پاک خط۔

۵۔ کتاب "وجہ دین" اردو حصہ اول ص ۱۲۰-۱۲۲۔

۶۔ سورہ رحمن آیت ۵۸، ۶۳، ۶۶۔

۷۔ سبز رنگ کی تاویل فرمانبرداری اس طرح سے ہے، کہ سورہ تحریم کی آیت ۱۲ میں

حضرت مریمؑ کی فرما تبرداری کا ذکر آیا ہے، اور آلِ عمران کی آیت ۳۷ میں اس کے سرسبز ہونے کا اشارہ ہے جو اس کی روحانی زندگی کی مثال ہے۔

نہ سُرخ رنگ قربانی اور حقیقی زندگی کی علامت اس طرح سے ہے، کہ شہادت اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے بموجب وہ اصل زندگی ہے جس میں حق تعالیٰ کی قربت و نزدیکی بدرجہ اتم میسر ہو جاتی ہے، جس کا ذکر آلِ عمران آیت ۱۶۹ - ۱۷۱ میں ہے۔

LS

**Institute for
Spiritual Wisdom
and
Luminous Science**

Knowledge for a united humanity

صراطِ مستقیم

تعریف | صراطِ مستقیم میں دو لفظ ہیں، صراط اور مستقیم، صراط کے معنی راستہ اور مستقیم کے معنی ہیں سیدھا، پس صراطِ مستقیم کے معنی ہوئے سیدھا راستہ، یعنی ایسا راستہ جو ٹیڑھا نہ ہو، جس میں کوئی اونچ نیچ اور اتار چڑھاؤ نہ ہو، جو بالکل منزل مقصود کی سیدھ میں ہو، اور جس پر چلنے والے کے لئے ہر طرح کی سہولت مہیا ہو۔

مختلف صورتیں :

صراطِ مستقیم، سیدھا راستہ قرآنِ پاک کی بے پایاں حقیقت و حکمت کی مثالوں میں سے ہے، یہ مثال سب سے پہلے اُم الکتاب یعنی سورۃ فاتحہ میں سامنے آتی ہے، اور دوسری بہت سی سورتوں میں بھی اس کا ذکر موجود ہے، جس کی لفظی صورتیں مختلف ہیں، مثلاً صراط اللہ ﷻ (خدا کا راستہ) الصراطِ السوی ﷻ (راہِ راست یا سیدھا راستہ) صراطِ الحمید ﷻ (خدا کے لائق حمد کی راہ) سواء القراط ﷻ (سیدھی راہ) صراطاً سوياً ﷻ (سیدھا راستہ) سواء السبیل ﷻ (سیدھا راستہ) سبیل اللہ ﷻ (اللہ کی راہ) سبیل المؤمنین ﷻ (مؤمنوں کا راستہ) سبیل الرشید ﷻ (ہدایت کا راستہ) قصد السبیل ﷻ (سیدھا راستہ) سبیل الرشاد ﷻ (ہدایت کا راستہ) سبیلی ﷻ (میری راہ یعنی پیغمبر کی راہ) سبیل السلام

۱۴ (سلامتی کی راہیں یعنی تائید الہی کی راہیں)۔

صراطِ مستقیم کا مقصد:

قرآن پاک کے مذکورہ حوالہ جات سے ظاہر ہے کہ صراط اور سبیل دونوں لفظوں کا ایک ہی مطلب ہے، اور یہاں یہ حقیقت بھی واضح ہوئی کہ یہ صراطِ مستقیم یا سبیلِ رشد و ہدایت اللہ تعالیٰ کی ہے کہ اس نے سچے دین کا یہ راستہ بنایا، اور لوگوں کو اس پر چلانے کے لئے پیغمبر بھیجے تاکہ ان کو خدا تعالیٰ کی قربت و نزدیکی حاصل ہو، نورانیت کا عظیم ترین دیدار حاصل ہو، اور خدا کی ملاقات و معرفت کے ذریعہ ابدی نجات اور دائمی سکون ملے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

”إِنَّ رِجْزَ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝۶۱“ یقیناً میرا پروردگار صراطِ مستقیم پر ہے، یعنی صراطِ مستقیم پر چلنے سے خدا ملتا ہے، اللہ تعالیٰ نے یہی اپنا راستہ بنائیں، صدیقین، شہداء اور صالحین کے علاوہ تابعین کو بھی عنایت فرمایا ہے۔

چنانچہ جب ہم قرآنِ حکیم کی اس پر حکمتِ تعلیم پر غور کرتے ہیں: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ، صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (ہمیں راہِ راست پر چلا لیجئے، ان لوگوں کی راہ (پر) جن پر تو نے انعام فرمایا ہے) تو ہمیں لازمی طور پر یہ شوق پیدا ہوتا ہے، کہ معلوم کر لیں، کہ یہ حضرت کون ہیں جن پر خدا کا انعام و اکرام ہوا ہے، جن کے نقشِ قدم پر چلنے کے لئے ہمیں یہ

تعلیم مل رہی ہے، پھر جب ہم قرآن مجید میں اللہ کے انعام یا نعمت سے متعلق
 عنوانات کی تلاش کرتے ہیں، تو ہمیں ایک آریہ کریم ملتی ہے، جس میں ان
 حضرات کا ذکر ہے جن پر خدا کا انعام و کرام ہوا ہے، جو اپنے وقت میں
 صراطِ مستقیم پر چل کر خدا سے واصل ہو چکے ہیں، اور وہ آیہ مقدسہ یہ ہے،
 ”وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ
 عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ ۗ عَلَيْهِمْ
 سَلَامٌ“ اور جو شخص اللہ اور رسول کا کہا مان لے گا، تو ایسے اشخاص بھی ان حضرات کے
 ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے، یعنی انبیاء اور
 صدیقین اور شہداء اور صلحاء۔

جبل اللہ :

جبل اللہ کے معنی ہیں خدا کی رسی، جس سے ایک ایسی بے مثال اور
 زندہ جاوید رسی مراد ہے، جو سبج زانہ قسم اور۔! فوق الفطری درجے
 کی ہے، کہ وہ نہ کبھی ٹوٹ جاتی ہے، اور نہ ہی کوئی ایسا زمانہ یا جگہ ہے جس
 میں یہ نہ پہنچ سکے، کیونکہ خدا کی رسی کے لفظی معنی میں جو مثال اور تصور پوشیدہ
 ہے، اس کی وضاحت اس طرح سے ہوتی ہے، کہ تمام بتی نوع انسان فی الوقت
 جس دنیا یا جس حالت میں رہتے ہیں، اس کا نام حکمائے دین کے نزدیک عالم سفلی ہے
 اور حقیقی مسترتوں کا عالم اس سے بالا و برتر ہے، جس کو عالم علوی کہا جاتا ہے
 پس یہی سبب ہے کہ خدائے حکیم نے اپنی بے پایان رحمت و عنایت سے

عالمِ علوی اور عالمِ سفلی کے درمیان ہمیشہ کے لئے پاک نور کی رسی قائم کر دی ہے تاکہ بندگانِ خدا فرما نبرداری، عبادت اور معرفت کے وسیلے سے اس کمنہ الہی سے وابستہ ہو کہ عالمِ علوی یا عالمِ بالا پہنچ سکیں۔

صراطِ مستقیم کا مَثول :

بیان مذکورہ بالا سے جب ہمیں یہ حقیقت صاف طور پر ظاہر ہوئی کہ صراطِ مستقیم یعنی سیدھا راستہ خدائے واحد کے بعد انبیاء، اولیاء، شہداء اور صلحاء کے علاوہ تمام تابعداروں سے بھی منسوب ہو سکتا ہے، یعنی اسے مومنین کا راستہ بھی کہا جا سکتا ہے، تو پھر ہم اس کے متعلق یہ اقرار کیوں نہ کریں کہ خدائے علیم و حکیم کی سیدھی راہ اور اس کی مضبوط رسی اپنے وقت میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے، اور آنحضرت کے بعد آپ کے وصی حضرت مولانا علی علیہ السلام تھے، اور ان کے سلسلہ اولاد کے آئمہ طاہرین قیامت تک اسی حیثیت سے ہیں، کیونکہ خدا کی سیدھی راہ اور خدا کی مضبوط رسی کا مَثول نورِ نبوت و امامت ہے، جیسا کہ بزرگانِ دین کی کتب سے ظاہر ہے۔

”فَاَلْتَبٰی فِی عَصْرِہٖ هُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِیْمُ وَالْوَصٰی بَعْدَہٗ کَذٰلِکَ، ثُمَّ یَنْتَظَرُوْا فِی اِمَامٍ بَعْدَ اِمَامٍ کُلِّ مَنہُمْ یَسْتَدِیْنُ اِلٰی مَنْ تَقَدَّمَ وِیْشِیْرَ اِلٰی مَنْ تَاَخَّرَ عِنْدَہٗ، فَالْشَیْءُ مُتَسَلْسِلٌ وَحِیْلٌ مِّنْ اِلٰہِ مَمْدُوْدٍ، اَحَدٌ حُرْفِیْہٖ یُبِیْدُ اِلٰہُ تَعَالٰی وَالْاٰخِرُ بِاٰیْدِیْنَا۔“

يَقُولُ اللَّهُ تَعَالَى، وَأَنَّ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا
 السَّبِيلَ فَتَفْتَرِقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ فَاحَقِّقْ مَنْ يَتَوَجَّهُ إِلَى الْمَشَارِقِ
 إِلَيْهِ فِي هَذَا الْبَابِ هُوَ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ عَلِيُّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ، وَهُوَ
 صِرَاطُ اللَّهِ الْمُسْتَقِيمِ الَّذِي يَقُولُ بظواهر التنزيل وَيَنْفَخُ فِيهِ
 بِالْبَيَانِ رُوحَ التَّوْوِيلِ نَمِّنْ سَلَكُهُ مِنْ الصَّنَدِ وَالْتَضَلُّلِ
 وَكَانَتْ نِعْمَ الْقُدْوَةَ لِدَارِ مَعَادَةٍ وَالذَّلِيلِ.

ترجمہ: پس پیغمبر (صلعم) خود ہی اپنے عصر میں "صراطِ مستقیم" ہیں، آپ کے بعد وہی ایسے ہی ہیں، پھر ایک امام کے بعد دوسرے امام میں یہ سلسلہ جاری رہتا ہے، اور ان میں سے ہر امام اگلے امام کی تصدیق و تائید کرتا ہے، اور اپنے بعد آئیوالے امام کے متعلق اشارہ کرتا ہے، پس یہ چیز اسی طرح مسلسل ہے، اور وہ رستی جو خدا کی طرف سے ہے بہت لمبی ہے جس کا ایک سیرا خدا کے ہاتھ میں اور دوسرا سیرا ہم بندوں کے ہاتھ میں ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "اور یہ کہ یہ میرا راستہ ہے جو کہ سیدھا ہے پس تم اسی راہ پر چلو، اور دوسری راہوں پر مت چلو، کہ وہ راہیں تم کو اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گی" پس اس بارے میں جس شخص کی طرف اشارہ سے کا رخ ہے وہ زیادہ حقدار شخص علی بن ابی طالب ہی ہیں، اور وہی خدا کا سیدھا راستہ ہیں، جو کہ نہ صرف تنزیل کے ظاہری معنی کے لئے قائم ہیں، بلکہ ساتھ ہی ساتھ اس میں اپنے بیان سے تاویل کی رُوح بھی چھونک دیتے ہیں، پس جو کوئی اس راستے پر چلے تو اسے خود گمراہ ہو جانے اور کسی کے گمراہ کر دینے کا کوئی

ڈھہیں، اور اس کے آخری گھر (یعنی منزل مقصود) تک رہنمائی کے لئے مولانا علی بہترین رہنما و پیشوا ہیں۔ (المجاس السنہ ص ۱۶۹-۱۷۰)۔

ہم کیسے خدا کو پکڑ لیں :

صراطِ مستقیم اور خدا کی رستی نورِ امامت کی حیثیت و صورت میں ہونے کی ایک اور قرآنی دلیل اس آیت کریمہ میں ہے کہ : وَمَنْ يَتَّصِرْ بِاللهِ فَغَدَّ هُدًى اِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝۱۱ اور جس شخص نے خدا کو مضبوط پکڑ لیا وہ سیدھے راستے لگ گیا، آپ کسی تعصب کے بغیر صاف دلی سے سوچ کر بتائیے کہ کس طریقے سے ہم خدا کے بزرگ و برتر کو مضبوطی سے پکڑ سکتے ہیں، کیونکہ اگر یہ امر ممکن ہوتا کہ ہم اللہ کے پاک و امن کو مضبوطی سے پکڑ سکتے تو یہ شروع ہی سے ممکن ہوتا، اور اس صورت میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے انبیاء علیہم السلام لوگوں کی رہنمائی کے لئے نہ آتے، آسمانی کتابیں بھی نازل نہ ہوتیں، اور آئمہ ہدٰی علیہم السلام بھی مقرر نہ ہوتے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے انسانی ہدایت و رہنمائی کے یہ تمام وسائل و ذرائع موجود ہیں، پھر آپ ہی بتائیے کہ مذکورہ ارشاد کی حکمت کیا ہے؟ معلوم ہے کہ آپ بھی یہی بتائیں گے کہ خدا کو مضبوطی سے پکڑ لینا یہ ہے کہ ہم خدا کی رستی کو مضبوطی سے تھامے رہیں، اور اللہ کی مضبوطی سلسلہ نبوت و امامت کا نور ہی ہے، جو ازل سے ابد تک قائم و دائم ہے، اور یہی نور خود خدا کا سیدھا راستہ ہے، جیسا کہ مذکورہ آیت کے قریب ہی اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ :

”وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ۗ“ اور تم سب کے سب مل کر خدا کی رستی مضبوطی سے تھامے رہو، اور فرقہ فرقہ نہ ہو جاؤ، تاکہ تمہیں ضلالت و گمراہی کی پستیوں سے رشد و ہدایت کی بلندیوں پر اٹھایا جائے۔ کیا آپ نظام کائنات پر غور و فکر نہیں کرتے کہ سمندر کی رستی یا کہ راستہ دریا ہے، اور سورج کی رستی اور راستہ روشنی ہے، چنانچہ پانی کے قطرے دریا سے وابستہ ہو کر سمندر میں داخل ہو سکتے ہیں، یہ ہوا ان قطروں کا سمندر کی رستی کو مضبوطی سے پکڑ کر ہدایت پا جانا، یا کہ سمندر کے مقرر کردہ راستے پر چل کر سمندر سے جا ملنا، اسی طرح انسانوں کی نگاہیں نور کی رستی، روشنی کے راستے اور شعاعوں کے پُل سے سورج تک پہنچ سکتی ہیں۔

مذکورہ بالا تفصیلات کا خلاصہ ذیل نتیجہ ہے کہ، ہمیں امامِ حجتی و حاضر کے مقدس دامن کو مضبوطی سے پکڑنا چاہئے، اور وہ یہ ہے کہ ہم اس کے امر و فرمان پر جان و دل سے عمل کریں، تاکہ جس سے ہم امامِ زمان کے نور کی رستی سے وابستہ ہو سکیں، کیونکہ یہی نور اللہ کی وہ رستی ہے جس کا ایک سیرا خدا کے ہاتھ میں اور دوسرا سر ابراہیم بندوں کے ہاتھ میں ہے، جیسے کہ سورج کی روشنی کا ابتدائی سیرا خود سورج میں ہے، اور انتہائی سیرا زمین کی سطح کو چھوتا ہے اور دوسری مثال میں امام کا نور خدا کا وہ راستہ ہے کہ جس پر چلنے والوں کو داخل جانا ہے، اور جن کو خدا ملتا ہے، ان کو کیا نہیں ملتا !

سوال :

قرآن مجید میں منزلِ مقصود کی طرف جانے یا اللہ کی نزدیکی و قربت حاصل

کرنے سے متعلق جتنی مثالیں آئی ہیں وہ سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں، چنانچہ ایک مثال کا تصور یہ ہے جیسے کوئی انسان ایک سیدھے راستے پر خدا کی طرف چل رہا ہو، دوسری مثال یہ تصور پیش کرتی ہے، کہ جیسے عرشِ اعلیٰ سے زمین تک ایک رستی قائم ہو، اور بندگانِ خدا اسی کے ذریعہ خدا کے حضور تک پہنچتے ہوں، تیسری مثال سیڑھی کا تصور دیتی ہے، جسے عربی میں معراج کہتے ہیں، جیسے قرآن حکیم میں ہے کہ فرشتے اور رُوحِ پچاس ہزار برس کی مدت میں سیڑھیوں سے چڑھ کر خدا کے پاس جاتے ہیں، اور چوتھی مثال ایک پل کا نقشہ انسانی ذہن کے سامنے لاتی ہے، جسے پلِ صراط کہتے ہیں، تو آپ بتائیے کہ ہم ان مختلف مثالوں میں سے کس کے تصور کو قائم کریں۔

جواب:

جاننا چاہئے کہ قرآن کی مذکورہ مثالیں اور ان کے علاوہ جتنی بھی مختلف مثالیں ہیں، وہ سب کی سب ایک ہی حقیقت رکھتی ہیں اور وہ حقیقت نور ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هَذَا الْقُرْآنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۗ ﴿۱۸﴾
 اور یقیناً ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لئے ایک مثال پھر پھر کہ بیان کر دی ہے، اس ارشادِ الہی کا مطلب صاف ظاہر ہے، کہ روحانی حقیقت کی ہر مثال قرآن میں طرح طرح سے بیان کی گئی ہے، یا یوں کہنا چاہئے کہ ایک حقیقت کو سمجھانے کے لئے کئی مثالوں سے کام لیا گیا ہے، اس کا سبب یہ

ہے کہ مادیت محدود ہے، اور روحانیت یا روحانی حقیقت لامحدود، اس لئے یہ ممکن نہیں کہ ایک مادی چیز کی مثال کسی روحانی حقیقت کی پوری پوری ترجمانی کر سکے، پس نور کی حقیقت سمجھانے کے لئے جہانیت کی بے شمار مثالیں رکھیں، کیونکہ قرآن زبانِ حکمت سے کہہ رہا ہے کہ کائنات کے ظاہر و باطن کا بکام نور ہی کر رہا ہے، اس کے یہ معنی ہیں کہ اگرچہ نور صرف ایک لفظ ہے یا ایک اسم ہے، لیکن یہ اپنی وسعتِ معنوی کے لحاظ سے تمام الفاظ اور سارے اسماء پر محیط و حاوی ہے۔

نور کی مختلف مثالیں :

چنانچہ اگر مانا جائے کہ منزل مقصود انسانوں سے دُور واقع ہے، تو اس صورت میں نور کی مثالیں اس قسم کی ہوں گی، سیدھی راہ، رہنما، ہدایت، روشنی، وغیرہ۔

اگر عقیدہ رکھا جائے کہ انسانوں کو ایک انتہائی بلند مقام پر پہنچ جانا ضروری ہے، تو اس حالت میں نور کا تصور ایک ایسی مضبوط رسی کی طرح ہوگا جو عرض برین سے فرشِ زمین تک پہنچی ہوئی ہو، یا ایک ایسی سیڑھی کا تصور ہو گا جو زمین سے فلک الافلاک کی چھت پر چڑھنے کے لئے قائم کی گئی ہو، یا ایک ایسی مثالی براق کو فرض کرنا ہوگا جو چشمِ زدن میں زمین سے آسمان پر پہنچتا ہو۔

اگر کہا جائے، کہ دنیا ایک طوفانِ خیرِ سمندر ہے تو اسی نسبت سے مانا

پڑے گا کہ سچا مذہب اس طوفان میں سمندری جہاز کی طرح ہے، اور ہادی برحق اس جہاز کا چلانے والا ہے۔

اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ روحانیت کا ایک روشن عالم موجود ہے، تو یقین کرنا ہوگا کہ نور ہی اس روحانی عالم کے آسمان کا سورج ہے۔

اگر یہ مثال مان لی جائے، کہ دنیا کے ایک تاریک گوشے میں آبِ حیات کا سرچشمہ موجود ہے، لیکن خضر کی رہنمائی کے بغیر وہاں تک کوئی شخص نہیں جاسکتا، اور جو شخص آبِ حیات کو حاصل کر کے پی سکے تو وہ کبھی نہیں مرے گا، تو اس مثال کا مشول بھی نور کی معرفت ہوگا۔ وہ اس طرح کہ تاریک گوشے سے ایک ایسی ذہنیت مراد ہے جس میں غفلت و جہالت کے سوا کچھ نہ ہو، خضر سے نور کی شخصیت مراد ہے، اور آبِ حیات کے معنی نور کی معرفت ہے، پس جو شخص امام زمان (جو نور کی شخصیت ہیں) کی رہنمائی میں نور کی معرفت حاصل کر سکے تو اس کی مثال ایسی ہے جیسا کہ اس نے خضر کی رہبری میں آبِ حیات پیا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے لافانی و پائندہ رہا۔

خلاصہ یہ ہے، کہ نور کی بے شمار مثالیں ہیں، اور وہ سب اپنی اپنی جگہ پر درست اور صحیح ہیں اور ہمیں ان تمام تصورات پر یقین رکھنا ہے، لیکن ایک ضروری بات یاد رہے، اور وہ یہ ہے کہ ان تمام مثالوں کے باوجود نور کو بے مثال بھی ماننا ہے، ورنہ نور کے متعلق ہمارا نظریہ محدود ہو کر رہ جائے گا۔

منقبت (باب الحکمت)

(۱) منظرِ کبریا کہ دگارِ امامِ زمان
رہبرِ کامگارِ امامِ زمان

ترجمہ :- اللہ تعالیٰ کے (اسمِ الظاہرِ چمکے) منظرِ امامِ زمان ہیں، بامقصد اور کامیاب
رہنما امامِ زمان ہیں۔

(۲) وارث و عترتِ نبی و علیؑ
صاحبِ ذوالفقارِ امامِ زمان

ترجمہ :- حضرت نبی محمد اور حضرت مولانا علی علیہما السلام کے وارث و جانشین اور
اولاد، اور ذوالفقار کے مالک امامِ زمان ہیں۔

وضاحت :- ذوالفقار مولانا علی علیہ السلام کی مشہور و معروف تلوار کا
نام ہے، لیکن یہاں ذوالفقار سے مراد علم و حکمت کی تلوار ہے، جیسا کہ شنوی
کا قول ہے :-

نکھتا چون تیغ فولاد است تیز
چون نداری تو سپردا پس گمیز

نیز بڑوشکی میں ہے،

عقلہ غتخ، اریٹھ منکن روہ ہنغرہ سوارنوں

جیہ کھنڈ ایون تین مینن بی جا امام جون

د عقل کی تلوار ہاتھ میں لے کر روح کے گھوڑے پر سوار ہو کر نفس

انسانی کے تمام قلعوں کو مسخر کر کے میرے امام کا ہمتل کون ہے؟

حضرت مولانا سلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ کے ایک پاک فرمان میں

بھی ہے کہ امام زمان اس دور میں شمشیر علم و حکمت سے کام لے رہے ہیں۔

قبلہ دین و کعبہ ایمان

(۳) مقصد کہ دگار امام زمان

ترجمہ: دین کا قبلہ اور ایمان کا کعبہ یعنی نور الہی کا گھر، اور اللہ تعالیٰ کا مقصد

نشاء امام زمان ہیں۔

معدن علم و مخزن عرفان

(۴) مایہ افتخار امام زمان

ترجمہ: ظاہری اور باطنی علم کی کان، ربانی معرفت کا خزانہ اور بزرگی و عزت

کا سرمایہ امام زمان ہیں۔

لے، ایک ایسے پاک فرمان کی نقل دنیوز (گلگت) کے موکھی اجابت شاہ صاحب کے
پاس موجود ہے۔

مصحفِ ناطق و کتابِ مبین
(۵) ہادی نامہ دار امام زمان

ترجمہ :- بولنے والا قرآن اور بیان کرتے والی آسمانی و الہامی کتاب اور نامور مددی و پیشوا امام زمان ہیں۔

دوست دارانِ باحقیقت را
(۶) مونس و غمگسار امام زمان

ترجمہ :- باخبر اور حقیقت شناس دوست داروں کے واسطے، راحت رسان اور غمخوار امام زمان ہیں۔

نورِ خلاق کائنات بُوَد
(۷) دامنِ آشکار امام زمان

ترجمہ :- کائنات بنانے والے کا نور ہیں، ہمیشہ ظاہر اور آشکار ہو کر امام زمان۔

زمرہ مومنانِ عالم را
(۸) ذکیرِ لیل و نہار امام زمان

ترجمہ :- اس دنیا کے گروہِ مومنین کے لئے، امام زمان شب و روز کا ذکرِ الہی ہیں۔

وجہات :- (۹) جیسا کہ بیت ۱ سے یہ مطلب واضح ہو جاتا ہے

کہ امام زمان، خدا کے اس اسم کے منظر ہیں، جس کو "الْخَاطِر" کہا جاتا ہے، پس اگر کوئی بندہ مومن شب و روز یا ظاہر، یا ظاہر، یا ظاہر، یا ظاہر، یا ظاہر، یا ظاہر کا ذکر کرتا رہتا ہے تو آپ ہی بتائیے کہ وہ کس کے وسیلے سے کس کو یاد

کرتا ہے؟ امام زمان کے وسیلے سے خدا کو یاد کرتا ہے، اگر اس بات میں آپ کو شک ہے تو وسیلہ کی تحقیق کے لئے قرآن حکیم کی آیات ۲۵ اور ۲۶ میں دیکھئے، پھر آپ خود یہ فیصلہ دیجئے کہ خدا، اور بند سے کے درمیان اگر کوئی وسیلہ ڈھونڈا جاسکتا ہے تو یہ وسیلہ کن کن باتوں میں جائزہ اور کن کن امور میں ناجائزہ ہوتا ہے۔

(ب) قرآن و سنت دونوں گواہ ہیں، اور مختلف روایات کی تفصیل سے ظاہر ہے کہ خدائے تعالیٰ اور آنحضرتؐ کے درمیان کئی وسائل تھے، مثلاً اخلاقِ حسنہ اور عبادت، جس نے حضورؐ کو مقامِ وحی کے قریب لایا، پھر الفاظِ وحی، جو کہ آنحضرتؐ اور جبرائیل کے درمیان وسیلہ تھے، یا خود جبرائیل، میکائیل، اسرافیل، لوح اور قلم، پھر واقعہ معراج کے متعلق روایت ہے کہ حضورؐ براق پر سوار ہو کر خدا کے انتہائی قریب گئے، پھر حجاب کے پیچھے سے اللہ تبارک و تعالیٰ نے بطورِ وحی آنحضرتؐ سے کلام کیا۔ اب اس مقام ”أُوْاْذُنِي“ پر بھی ہم کو وسیلہ ہی نظر آتا ہے، چنانچہ اگر مان لیا جائے کہ اس موقع پر اللہ تعالیٰ کا کلام ایسا ہی تھا جیسے قرآن میں ہے، تو اس سے یہ ثابت ہو گا کہ خدا اور پیغمبر کے درمیان اُس وقت حروف و وسیلہ تھے یا آواز کو لیجئے، اور کہتے ہیں کہ شب معراج میں حضورؐ اگر تم جو خدا کی پاک آواز سن رہے تھے وہ حضرت امیر المؤمنین علیؑ کی آواز سے مشابہ تھی، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدائے لاشریک اور اس کے محبوب کے درمیان ایک تیسری شخصیت کا تصور اور وسیلہ کیوں ضروری ہوا؟

(ج) قرآن حکیم کی آیت ۳۱ میں جو ارشاد ہوا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص خدا سے محبت رکھنے کا دعویٰ دار ہو، اسے آنحضرتؐ کی تابعداری کرنی چاہئے، تاکہ خدائی الواقع ایسے شخص سے محبت رکھے، اور اس کے گناہ معاف کر دے، اس سے معلوم ہوا کہ خدا کی محبت کا وسیلہ بس یہی ہے کہ رسولؐ کی تابعداری کی جائے، اور حضورؐ سے محبت ہو، جب خدا کی فرمانبرداری، محبت اور مغفرت براہ راست ممکن نہیں تو لازماً دوسرے تمام امور کے لئے بھی خدا اور بندے کے درمیان وسیلہ ہونا چاہئے۔

خانہ حکمت محمدؐ را

(۹)

باب عالی وقار امام زمان

ترجمہ: حضرت محمدؐ کے خانہ حکمت کے واسطے، عالی قدر دروازہ امام زمان ہیں۔

عاشقانِ جمالِ معنی را

(۱۰)

دلبرِ گلغدارِ امام زمان

ترجمہ: یاطنی حسن و جمال کے عاشقوں کے لئے، یکتا حسین و جمیل معشوق امام زمان ہیں۔

در ظہورِ ایتِ نورمی بینم

(۱۱)

واحد و صد مزارِ امام زمان

ترجمہ: میں نور کی تجلیوں اور جلوہ نمائیوں میں مشاہدہ کر رہا ہوں کہ امام زمان ایک بھی ہیں، اور لاکھ بھی۔

وضاحت :- (۱) امام دراصل نور کا نام ہے، اور نور کا مل ہمیشہ

کے لئے ایک ہوتا ہے، یہی ایک نور ہے جس نے تمام پیغمبروں اور اماموں کے جسمانی لباس میں ملبوس ہو کر دنیا والوں کی ہدایت و رہنمائی کی، اور اس نور کے جسمانی ظہورات یہ ہوئے اور اسی معنی میں وہ ایک بھی ہوا اور لاکھ بھی ہوا۔

(ب) دینی اور دنیاوی طور پر اس عظیم دور میں جو واقعات ہو گئے ہیں، اور جو واقعات مستقبل میں آئیں گے ہیں، ان سب کے زندہ اور لطیف نمونے روحانی مشاہدات و تجربات میں پیش آتے ہیں، پھر یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ قد ایک مروجہ صوفی کے عالم تصور میں تجلیاتی طور پر ایک بھی ہوا اور لاکھ بھی (ج) ہم عالم روحانیت کی مثال اس مادی دنیا سے لے سکتے ہیں، چنانچہ عالم ظاہر کا نور ایک ہے، لیکن یہ ایک لاکھ بھی بن سکتا ہے، وہ اس طرح کہ آپ ایک لاکھ آئینے سورج کی طرف رخ کر کے رکھ دیجئے، ان میں ایک لاکھ سورج نظر آئیں گے، لیکن پھر بھی سورج اپنی اصلیت میں ایک ہی رہے گا، بڑھ سکی قول ہے:

تمہ لکن شیل دیو دندرا سہ اویہ نلو بیہ بے ؟

حالمک سگ نہ ہمیش نورہ اکھیس سان یٹم

(ترجمہ :- ایک کروڑ رنگِ پتور پھیلا کر دیکھو کیا سورج ان سب میں سے

یا نہیں ؟۔ میں نے ایک عجیب و غریب نورانی سورج دیکھا جو ساری دنیاؤں

کو متور کر رہا ہے)۔

من چو بلبل زجان و دل شیدا
(۱۲) گلشن خود بہار امام زمان

ترجمہ :- میں بلبل کی طرح حقیقی پھولوں پر جان و دل سے عاشق ہوں ،
اور امام زمان ایسے پھولوں کا سدا بہار گلشن ہیں ۔

از چہ ترسیم تا ابد بودہ
(۱۳) شہر مارا حصہ امام زمان

ترجمہ :- یہیں کس چیز کا ڈر ہے ! کیونکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہمارے
دینی شہر کی فیصل اور شہر پناہ امام زمان ہیں ۔

من گدائی کہیم دور اتم
(۱۴) شاہ عالی تبار امام زمان

ترجمہ :- میں (یعنی نصیر) زمانے کے کہیم یعنی سخی کا گدا ہوں اور امام
زمان ہمارے عالی نسب یاد شاہ ہیں ۔

۱۔ یہ منقبت اور ایک دوسری نظم جس میں مولانا حاضر امام کی تشریف آوری کی
تعریف و توصیف ہے ، احمد آباد جماعت خانہ کے کپاؤنگ گیٹ کی دونوں جانب کے
کتبوں کے لئے تیار کی گئی تھیں ، گیٹ کا نام ”باب الحکمت“ یعنی حکمت کا
دروازہ رکھا گیا تھا ، اس مناسبت سے کہ نور علی زمان آنحضرت کے خانہ حکمت کا گیٹ

اصول و فروع دین

حق تعالیٰ نے قرآن پاک میں عالم دین اور اس کی حقیقتوں کی مثالیں اس ظاہری دنیا کی چیزوں سے دی ہیں، مگر چونکہ دین کی حقیقتیں تہایت ہی وسیع اور مادی چیزیں بہت ہی محدود ہوا کرتی ہیں، اس لئے یہ امر ضروری تھا کہ دین کی کسی حقیقت کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے لئے ایک نہیں بلکہ بہت سی ایسی مادی مثالیں دی جائیں کہ جن کی مشابہت و مطابقت کی مدد سے انسان اس حقیقت کو بخوبی سمجھ سکے۔

درختِ دین :

چنانچہ قرآن مجید میں دینِ حق کی ایک مثال ایک ایسے سدابہار اور پاک درخت سے دی گئی ہے کہ جس کی جڑیں زمین میں ہمیشہ کے لئے مضبوط و مستحکم اور شاخیں آسمان میں جا لگی ہوں، جو اپنے پروردگار کے اذن سے ہر وقت اور ہر موسم میں پھل دیتا رہتا ہو، جو اس طرح ہر وقت فائدہ پہنچانے کے اعتبار سے ایک ایسے معجزانہ کلمے کی مانند ہو کہ اس کلمے سے ہمیشہ علم و

حکمت کے سرچشمے جاری و ساری ہوں ، دین کے پاک درخت کی وہ قرآنی مثال درج ذیل ہے :-

الْحَوْتَ وَكَيْفَ صَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً خَلِيَّةً كَشَجَرَةٍ خَلِيَّةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ تُؤْتِي أَكْلَهَا كُلَّ حِينٍ يَا ذُنَّ رَبِّهَا وَيَصْرِبُ اللَّهُ الْآمَنَاتِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ^{۱۳}_{۲۵-۳۰}

” (رسول!) کیا آپ نے یہ نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے پاک کلمے کی مثال کیسے دی ہے ، کہ وہ ایک پاک درخت کے مانند ہے ، اس کی جڑ مضبوط ہے ، اور اس کی شاخ آسمان میں پہنچی ہے ، وہ اپنے پروردگار کے حکم سے ہر وقت پھل دیتا ہے ، اور اللہ تعالیٰ لوگوں کے لئے مثالیں بیان فرماتا ہے ، تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں ۔“

جب معلوم ہوا کہ دین حق کی مثالوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ دین گویا ایک صدا بہار اور ہمیشہ ہمیشہ پھل دینے والا پاک درخت ہے ، تو تمام دین داروں کے لئے یہ امر ضروری و لازمی ہوا کہ وہ اپنے درختِ دین کی جڑوں اور شاخوں کی کیفیت و حقیقت کو بخوبی سمجھ لیا کریں ، تاکہ ان پر اس کی تمام خوبیاں ظاہر ہونے کے سبب سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کیا جاسکے ۔

اصول دین :

” اصل ” درخت کی جڑ کو کہتے ہیں ، اور اصل کی جمع ” اصول ” ہے ، جس

کے معنی ہوئے جڑیں، چنانچہ اصولِ دین چار ہیں :

۱۔ عقلِ کل۔

۲۔ نفسِ کل۔

۳۔ ناطق۔

۴۔ اساس۔

ان میں سے پہلی دو اصلیں روحانی ہیں اور دوسری دو اصلیں جسمانی۔

پہلی اصل = عقلِ کل :

عقلِ کل علمِ الہی کا انتہائی عظیم فرشتہ اور عقولِ جزوی کا سرچشمہ ہے، اس عالیشان فرشتے کے اور بھی بہت سے نام ہیں، جیسے عرشِ الہی، آدمِ اقل، قلمِ قدرت، نورِ محمدی یا کہ نورِ نبوت وغیرہ، اور ان تمام ناموں کی حقیقت ایک ہے، چنانچہ ان مشہور احادیث کی شہادت سے اس بات کی تصدیق و توثیق ہو جاتی ہے کہ : **أَوَّلُ مَا خَلَقَ اللَّهُ الْعَقْلَ**، یعنی سب سے پہلی چیز جو اللہ نے پیدا کی وہ عقل ہے : **أَوَّلُ مَا خَلَقَ اللَّهُ نُورِي**، سب سے پہلی چیز جو اللہ نے پیدا کی وہ میرا نور ہے۔ **أَوَّلُ مَا خَلَقَ اللَّهُ الْقَلَمَ**، سب سے پہلی چیز جو اللہ نے پیدا کی وہ قلم ہے۔

یہاں پہلی حدیث میں ہے، کہ خلق کے لحاظ سے عقل پہلی چیز ہے، دوسری میں ہے، کہ نورِ محمدی سب سے پہلے پیدا ہوا، اور تیسری میں ہے کہ ہر چیز سے قبل قلم وجود میں آیا، اگر یہاں یہ سمجھا جائے کہ ان حدیثوں میں تین الگ الگ چیزوں کے سب سے پہلے پیدا کئے جانے کا

ذکر ہے، تو ان میں سے کسی کی بھی اولیت ثابت نہ ہو سکے گی، کیونکہ اس صورت میں یہ حدیثیں ایک دوسرے کی تردید و نفی کرتی ہیں، پس سوائے اس کے کوئی اور نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ عقلِ کل، نورِ محمدی اور قلمِ الہی جیسے ناموں کی حقیقت ایک ہی ہے۔

دوسری اصلِ نفسِ کل :

نفسِ کل دوسرے درجے کا وہ عظیم فرشتہ ہے، جسے ہم مثال کے طور پر نفوسِ خلّاق کا سب سے بڑا سمندر کہہ سکتے ہیں، اور اس مقام پر یہ بات بھی خوب یاد رہے کہ جہاں عقلِ کل کو عرش کہا جائے وہاں نفسِ کل کو سہی کہلائے گا، جب عقل کو آدم کا نام دیا جائے تو تب نفسِ حوا کے اسم سے موسوم ہوگا، اگر اُسے قلم کی مثال دی گئی تو اس کو لوح سے تشبیہ دینی پڑے گی، اور ہاں اگر عقلِ کل نورِ محمدی کا نام ہے تو نفسِ کل نورِ علیؑ کو کہتے ہیں، جیسا کہ رسولِ اکرمؐ کا ارشاد ہے :

أَنَا وَأَنْتَ يَا عَلِيُّ ابْنَا الْمُؤْمِنِينَ ط اے علی! میں اور آپ تمام

مؤمنین کے (روحانی) ماں باپ ہیں۔

جاننا چاہئے، کہ مؤمنین کے یہ روحانی ماں باپ ازل سے موجود ہیں،

کیونکہ یہ حقیقت سب کے نزدیک مسلمہ ہے، کہ جملہ ارواحِ ازل میں پیدا ہوئی تھی، پس لازم آتا ہے، کہ روحوں کے ماں باپ پہلے سے موجود

ہوں۔

نیز جاننا چاہئے کہ مذکورہ حدیث میں جن مومنین کا ذکر آیا ہے وہ تمام انبیاء، ائمہ مطہرین اور ہر زمانے کے تابعدار بند سے ہیں، چنانچہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ "أَنَا مِنَ اللَّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ مِنِّي"۔ یعنی میں خدا سے ہوں، اور جملہ مومنین مجھ سے ہیں۔ اس کا صاف و صریح مطلب یہ ہے، کہ یہ مومنین نہ صرف امت مسلمہ میں سے ہیں، بلکہ یہ دوسرے تمام پیغمبروں کی امتوں میں سے بھی ہیں، کیونکہ مذکورہ بالا حدیث کی روشنی میں یہ حقیقت ثابت ہوئی کہ ابتداء میں خدا کے نور سے بعنوان عقل کُلِّ و نفس کُلِّ محمدؐ و علیؑ کا نورانی ظہور ہوا، اور ان دونوں حقرات کے پورے سارے انبیاء، ائمہ اور ہر امت کے مومنین کی ارواح پیدا ہوئیں۔

تیسری اصل = ناطق :

ناطق کے لغوی معنی بولنے والا ہیں، اور اصطلاح میں اس سے ایسا پیغمبر مراد ہے، جو صاحب کتاب و شریعت ہونے کی حیثیت سے لوگوں کو اپنے دین کی طرف دعوت کرے، اور ایسے ناطق پورے دور میں چھ آئے ہیں، یعنی حضرت آدم، حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور حضرت محمدؐ علیہم السلام اور آخری ناطق آنحضرتؐ ہیں۔

چوتھی اصل = اساس :

اساس کے لفظی معنی بنیاد کے ہیں، اور اصطلاحاً اس سے وہ امام

مُراد ہے جو ناطق کے ساتھ بحیثیت وزیر کے رہتا ہے، جس کو ناطق اپنے بعد وصی اور جانشین مقرر کرتا ہے، اس ناطق کے دور میں آنے والے تمام اماموں کے لئے بنیاد کا درجہ رکھتا ہے، ایسے اس ناطقوں کے برابر چھ ہوئے ہیں، یعنی مولانا شہید، مولانا سام، مولانا اسماعیل، مولانا ہارون، مولانا شمعون اور مولانا تضرعی علی علیہم السلام، اور آخری اس کا مولانا تضرعی علی علیہ السلام ہیں۔

واضح ہو کہ جس طرح ہر ناطق اپنے تابعداروں کو آسمانی کتاب کے ظاہری علوم کی تعلیمات دیتا ہے اس طرح اس کا اساس اپنے پیروؤں کو اسی آسمانی کتاب کے باطنی علوم سے واقف و آگاہ کر دیتا ہے، چنانچہ آخری دور کے ناطق یعنی حضرت محمدؐ نے اپنے وقت کے لوگوں کو قرآن کی تنزیل سے روشناس کر دیا، اور مولانا علیؑ نے اپنے عصر کے مومنین کو قرآن کی تاویل سے فیضیاب فرمایا، یعنی انہوں نے اپنے سلسلہ اولاد کے توسط سے ہر زمانے کے مومنین پر تاویل و حکمت کے دروازے کھول دیئے۔

فروعِ دین :

”فرع“ درخت کی شاخ کو کہتے ہیں، اور فرع کی جمع ”فروع“ ہے، جس سے درختِ دین کی شاخیں مُراد ہیں، چنانچہ فروعِ دین چھ ہیں :-
جہد، فتح، خیال، امام، حجت اور داعی۔ ان میں پہلی تین فرعیں رُوحانی اور دوسری تین فرعیں جسمانی ہیں۔

پہلی فرع = جَد :

جد حضرت اسرافیل علیہ السلام کا نام ہے، یہ فرشتہ صاحبِ صُور کہلا سنا ہے، یعنی نرسنگھا پھونکنے والا، چونکہ تمام تر ترجموں میں صُور کے لئے ”نرسنگھا“ لکھا گیا ہے، لہذا میں نے بھی ایسا ہی لکھ دیا، ورنہ صُور اسرافیل کے لئے یہ لفظ مناسب اور موزون نہیں، کیونکہ نرسنگھا دنیا کے سب باجوں اور سازوں سے نچلے درجے پر ہے، اور صُور اسرافیل رُوحانیت کے اسرارِ عظیم کے سلسلے میں ایک ایسا معجزانہ ساز ہے جو یقیناً ساکنانِ آسمان و زمین کو آن واحد میں مست و مدہوش کر دیتا ہے، تمام خلایق کی رُوحوں کو اپنی طرف مرکوز کر لیتا ہے، اور کشتگانِ عشقِ الہی کے لئے ابدی طور پر حیاتِ نو کا پیغام لاتا ہے۔

جد رُوحانی فروع میں سب سے اونچی فرع ہے، جیسا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: - "وَأَنْتَ تَعَالَى الْجَدُّ رَبِّنَا مَا نَعْبُدُ صَاحِبَهُ وَلَا وَدَائِهِ" اور یہ کہ ہمارے پروردگار کی شان (یعنی جد) بہت بلند ہے، اس نے کسی کو بیوی بنایا اور نہ اولاد۔ "یہاں جد، جس کا لفظی ترجمہ "شان" بھی ہو سکتا ہے، اسرافیل کے بارے میں آیا ہے؛ اور اس میں تعجب کی کیا بات ہے، کہ خدا

۱: دہرین حصہ دوم ص ۲۸ پر یہ عبارت درج ہے: "وَتَعَالَى الْجَدُّكَ"، کہتا ہے کہ برتر ہے تیرا جد (فرشتہ) کہ اس کے مقام تک ناطقوں کے سوا اور کوئی شخص پہنچ نہیں سکتا؛ نیز "اعلامِ اسماعیلیہ" کے صفحہ ۲۲ پر ہے کہ "جد" کا یہ نام مذکورہ آیت سے لیا گیا ہے۔

کی شان ایک فرشتہ ہو، جب کہ خدا کا تخت (عرش) کہ سی، قلم، لوح وغیرہ زندہ موجودات ہیں۔

دوسری فرع = فتح :

فتح حضرت میکائیل علیہ السلام کا دوسرا نام ہے، فتح کے معنی کھولنے کے ہیں، جس سے علم و حکمت اور تاویل کی کشائش مراد ہے، اور یہ تمام باتیں میکائیل سے متعلق ہیں، اسی وجہ سے اس کو فتح کہتے ہیں، قرآن حکیم کے ارشادات کا یہ اشارہ ہے کہ فرشتوں کی ہستی پر اقرار کر کے ان کی حقیقت کو سمجھ لیا جائے ان کی دوستی سے فائدہ حاصل کیا جائے، چنانچہ اس آیت کریمہ میں کافروں کی مذمت کی گئی ہے کہ وہ خدا، انبیاء، ملائکہ، جبرائیل اور میکائیل سے بغض و عداوت رکھتے ہیں، وہ ارشاد یہ ہے :

” مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَجِبْرِيلَ وَ

مِيكَائِيلَ فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِلْكَافِرِينَ ۝ ” جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبرائیل اور میکائیل کا دشمن ہو تو بیشک اللہ (بھی ان) کافروں کا دشمن ہے۔ ” سوال ہے کہ کس طرح کوئی شخص خدا اور اس کے فرشتوں کا دشمن ہو سکتا ہے؟ یہ تو قطعاً ناممکن بات ہے۔ ہاں یہ بات بالکل صحیح ہے کہ، خلیفہ خدا یعنی امام زمان سے دشمنی رکھنا خدا سے دشمنی رکھنا ہے، اور اس کے مقرر کردہ حجت (پیمر) داعی وغیرہ سے دشمنی فرشتوں سے دشمنی ہے، جس کا نتیجہ علم حقیقت سے محرومی ہے۔

تیسری فرع = خیال :

خیال حضرت جبرائیل علیہ السلام کا نام ہے، جو اسوۂ وحی کا ابتدائی فرشتہ ہے، جیسا کہ آنحضرتؐ کے اس ارشادِ گرامی سے ظاہر ہے کہ :-
 ”بَيْنِي وَبَيْنَ امَلِدِ خَمْسَ وَمَسَائِلًا : جبرائیل و میکائیل و اسرافیل و اللوح و القلم میرے اور خدا کے درمیان پانچ واسطے ہیں۔ جبرائیل، میکائیل، اسرافیل، لوح (نفسِ کل) اور قلم (عقلِ کل)۔“

چوتھی فرع = امام :

امام حاضر و موجود جسمانی فروع میں سب سے بالا و برتر فرع ہیں، اور امامِ عالمِ مقام کی برتری و بالادستی کے یہ معنی ہیں کہ وہ اپنے مرتبہ امامت میں روحانیت کے آسمان تک پہنچے ہوئے ہیں، جیسا کہ قرآنِ پاک کا ارشاد ہے :-
 ”أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ“ یعنی درختِ دین کی جڑ زمین میں مضبوط و مستحکم ہے، اور اس کی شاخ آسمان میں جا پہنچی ہے۔
 اگرچہ درخت کی شاخوں کے سیوے بلندی میں پک کر تیار ہو جاتے ہیں، لیکن بالآخر وہ زمین پر آگرتے ہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ امامِ زمانؑ کے مراتبِ عالیہ کی بلندی پر علم و حکمت کے جو پھل پائے جاتے ہیں، وہ زمینِ دین پر گرتے رہتے ہیں، اور زمینِ دینِ سومنین و مستجبین ہیں۔

درخت کا میوہ تین طرح سے حاصل کیا جاتا ہے، وہ یہ کہ درخت خود بخود پھل گرا دیتا ہے، کوئی شخص درخت پر چڑھ جاتا ہے، اور پتھر

لاٹھی وغیرہ مار کر گرایا جاتا ہے، اسی طرح درختِ دین کے پھل بھی تین طریقوں سے حاصل ہو سکتے ہیں، کہ امامِ زمان خود بخود اپنے مریدوں کی ہدایت فرماتے ہیں، مومنین میں سے کوئی عبادت و اطاعت کے وسیلہ سے روحانیت حاصل کر کے درختِ دین پر چڑھ جاتا ہے، اور ظاہری طور پر امام سے ضروری مسائل پوچھے جاتے ہیں۔ چنانچہ پیر نامِ خسر و مس فرماتے ہیں:

دانشِ ثمرِ درختِ دین است

بر شو بدرختِ مصطفائی

ترجمہ: علم و حکمت اور عقل و دانشِ دینی درخت کا پھل ہے، تم اسے حاصل کرنے کے لئے حضرت محمد مصطفیٰ کے درخت پر چڑھ جاؤ۔

تا میوہ جانقذ انی یابی

در سایہ برگِ مرتضائی

ترجمہ:- تاکہ تمہیں روح بڑھانے والا پھل حاصل ہو (جسے تم) مرتضیٰ

علیؑ کی شاخوں کے پتوں کے سائے میں دکھاؤ گے۔

چیزِ عجیبی نشانتِ دادم

زہیرا کہ تو آشتائی سائی

ترجمہ: میں نے تمہیں ایک عجیب و غریب چیز کی نشاندہی کی،

کیونکہ تم ہمارے دوست ہو۔

زان میوہ قوی شوی و باقی

گمہ برہ جستن بقائی

ترجمہ: اس (درختِ حیات کے) پھل سے تم روحانی طور پر طاقت ور اور زندہ ہو جاؤ گے، اگر تم دائمی بقاء و حیات کی جستجو کرتے ہو۔

درخت کی جڑیں اپنی تمام قوتیں شاخوں کی طرف بھیجتی رہتی ہیں، جس کی تاویل یہ ہے کہ عقلِ کُلّ، نفسِ کُلّ، ناطق اور اساس (جو درختِ دین کی جڑیں ہیں) ہمیشہ اپنے انوارِ امامِ زمان کی طرف بھیجتے رہتے ہیں۔ پھل اگرچہ نظامِ درخت کے اجزاء میں سے ایک جزو ہے، لیکن بحقیقت پھل میں درخت اپنے تمام اجزاء کے ساتھ سمایا ہوا ہے، یہ بات اول تھا اس اعتبار سے درست ہے کہ پھل میں پورے درخت کا خلاصہ اور جوہر موجود ہوتا ہے، نیز پھل درخت کے تمام افعال کا نتیجہ و ما حاصل ہوتا ہے، دوم اس اعتبار سے کہ پھل کے دانہ (گٹھلی) میں درخت بحدِ قوت موجود ہے، چنانچہ اگر گٹھلی کو زمین میں بو دیا جائے تو اس سے وہی درخت پیدا ہو کہ حدِ فعل میں آجاتا ہے، اس کی تاویل یہ ہے کہ امامِ زمان کا نورِ درختِ دین کی جڑوں اور شاخوں کا ما حاصل اور نتیجہ ہیں، پس اگر کوئی حقیقی مومن اپنے دل کی زمین میں امامِ زمان کی محبت و فرمانبرداری کے بیج کو جیسا کہ چاہئے بو کر پرورش کرے، تو یقیناً روحانی کیفیت میں اس کے دل سے پھر یہی پاک درخت بلند ہو کہ ہمیشہ کے لئے علم و حکمت کا پھل دینے لگتا ہے، جس کے بارے میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”وَكُلُّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُّبِينٍ ط ۳۶۔ اور ہم نے تمام

چیزوں (کے علم و حکمت) کو امامِ ناطق (کے نور) میں گھیر کر رکھا ہے۔
مطلب یہ کہ امامِ حاضر کی پاکِ محبت اور تابعداری کے نتیجے پر یہ سب کچھ
چشمِ باطن سے دیکھا جاتا ہے، اور اسی معنی میں مولوی مضموی اپنی مثنوی
میں فرماتے ہیں :-

عقلِ کلّ و نفسِ کلّ مردِ خداست
عرش و کرسیِ رامدانِ کزویِ خداست
یعنی انسانِ کامل ہی عقلِ کلّ اور نفسِ کلّ ہے، تم ایسا نہ سمجھنا کہ عرش و
کرسی اُس انسانِ کامل سے جدا کہیں اور جگہ ہے۔

پانچویں فرع = حجت :

لفظِ حجت کے کئی معنی ہیں، مگر یہاں حجت سے جو معنی ہیں، وہ
اس آیتِ مقدسہ سے ظاہر ہیں :-

”لَشَآءَ يَكُوْنُ لِلنَّاسِ عَلٰى اَمْرِ اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرَّسُوْلِ ؕ وَ
كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝۱۶“
اللہ تعالیٰ پر لوگوں کی کوئی حجت نہ رہ جائے، اور اللہ تعالیٰ غالبِ حکمت
والا ہے۔ اس آیتِ کریمہ کا مطلب یہ ہے، کہ اگر اللہ تعالیٰ پورے دُور
کے لوگوں کے لئے پیغمبروں کے ذریعہ سے ہدایت کا کوئی مستقل نظام مقرر
نہ فرماتا، تو خدائے تعالیٰ پر لوگوں کی حجت ہوتی، یعنی (نعموٰۃ باللہ) لوگ
دلیل میں خدا پر غالب آتے، کیونکہ حجت کا مطلب ہے دلیل میں غالب

آنا، یعنی قیامت کے روز جب خدا بندوں سے پوچھے گا، کہ تم نے دُنیا میں کیوں میری مرضی کے مطابق عمل نہیں کیا؟ تو لوگ یہ دلیل پیش کریں گے کہ پروردگار! آپ کی جانب سے کوئی ایسا شخص نہیں تھا جو ہمیں آپ کی مرضی سمجھنے کی ہدایت دے سکے، تو یہ ہوئی خدا پر لوگوں کی حجت یا کہ دلیل میں خدا پر لوگوں کا غالب آنا، مگر مذکورہ ارشاد سے صاف ظاہر ہے، کہ اللہ پر لوگوں کی کوئی حجت نہیں، بلکہ لوگوں پر خدا کی حجت ہے، اور وہ حجت یہ ہے کہ اس نے پیغمبر بھیجے ہیں، پس اسی معنی میں انبیاء علیہم السلام لوگوں پر خدا کی حجتیں ٹھہریے۔ چنانچہ اس دور میں لوگوں پر خدا کی حجت حضرت محمد مصطفیٰ صلعم میں، اس حضرت کی حجت اسائن ہیں، یعنی مولانا علیؑ، اسائن کی حجت زمانے کا امام ہے، اور امام کی حجت وہ بزرگ ہے جسے صاحبِ جزیرہ یا پیر کہا جاتا ہے، اور اسماعیلی عقائد میں حجت کا یہ لقب اسی درجے کیلئے زیادہ مستعمل ہے۔

چھٹی فرع: داعی:

داعی کے معنی ہیں دعوت کرنے والا، چنانچہ مرکزِ دعوت کی طرف سے جو شخص امرِ دعوت کے لئے مامور ہو جائے وہ داعی کہلاتا ہے، اور داعی حجت کے تحت ہوتا ہے، دعوت کے متعلق قرآن میں بہت سی آیات موجود ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے۔

أَدْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ

جَادِ لَهْمُ بِاللَّيْلِ هِيَ أَحْسَنُ ۱۳۵ (اے رسول!) آپ اپنے پروردگار کے راستہ کی طرف حکمت کے ساتھ اور اچھی نصیحتوں کے ساتھ بلا لیجئے، اور اس طریقے سے بحث کیجئے جو بہت ہی اچھا ہے۔

اس ارشادِ الہی سے ظاہر ہے کہ دین حق کی طرف دعوت کرنے کی بڑی شرط حکمت ہے، اور حکمت صرف پیغمبر اور امام ہی کے ذریعے سے کسی کو مل سکتی ہے، پس اسی وسیلے سے حکمت حجت کو مل سکتی ہے، اور حجت سے داعی کو حاصل ہو سکتی ہے۔

والسلام

Institute for
Spiritual Wisdom
and
Luminous Science
Knowledge for a united humanity

امام کے معجزانہ نشانات

شد کریم نورِ حق امام زمان
 رہبید کا بطن کون و مکان
 سببِ ختمِ رسلاً وہ آلِ علیؑ
 نائبِ مرتضیٰ ولی زمان

حق و حاضر ہے اس بہان میں مدام
 چونکہ ہے عقلِ عقل و مایہ جان

فائض النور دونوں عالم کا
 مثلِ نورِ شید ہے عیان و نہان

مجھ سے گر پوچھے کوئی اس کا نشان
 بے مثل ہے کہ ہے خدا کا نشان

بے نشان بھی ہے بارِ نشان بھی ہے
 منظرِ حق کی ذاتِ عالی شان

اک نشان یہ کہ ہے وہ آلِ نبیؐ
 ہادی دینِ قسیم نار و جہان

اک نشان یہ کہ حقیقتاً ہے
از ازل تا ابد شد دوران

حسین سیرت ہے اک نشان اس کا
جس کا ثانی نہیں چہ انس و پیمان

اک نشان یہ کہ بہرہ کرتا ہے
تا کہ ہو اس جہاں میں صلح و امان

کشفِ باطن ہے اک نشان اس کا
تا کہ ظاہر ہو ہم پہ گنجِ نہان

اک نشان یہ ہے کہ وہ دنیا میں
مثل کشتی نوح و کشتی بان

بے نیازی ہے اک نشان اس کا
کہ نہیں مدعی چنین و چیمان

اس کے صد ہا نشان ہیں ایسے
جن کا مجھ سے نہ ہو سکا ہے بیان

حق تو صیغہ شد ادا نہ ہوا
معترف ہے نصیبے سامان

توضیح الفاظ

- شہ = محفّت ہے شاہ کا۔
- سبط = بیٹے کی یا بیٹی کی اولاد۔
- عقلِ عقل = عقل کی عقل، یعنی عقلِ کل۔
- مایۃ جان = روح کا سرمایہ، یعنی نفسِ کل۔
- فائض الثور = روشنی بخشنے والا۔
- عیان و فہان = ظاہر و باطن۔
- قسیم = تقسیم کرنے والا۔
- منار و جنان = دوزخ اور بہشت۔
- چہ انس و چہ جان = کیا انسان اور کیا جنات۔
- کشفِ باطن = پوشیدہ حقیقتوں کا انکشاف کرنا۔
- گنجِ فہان = چھپا ہوا خزانہ، یہ اشارہ حدیثِ قدسی: کُنْتُ كُنْزُ الْكَيْطَرِ ہے۔
- کشتی بان = کشتی چلانے والا۔
- امام کا ایک نشان بے نیازی ہے، یعنی اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ میں ہی امام ہوں، تو حقیقی امام اس کے خلاف مقدمہ بازی نہیں کرتے، دیکھئے ”وجہِ دین“ حصہ دوم ص ۱۴۲۔
- صدیہ = سینکڑوں۔
- معتوف = اعتراف کر نوالا، یعنی قائل۔

آیاتِ دُعا کے بنیادی حقائق

حضور مولانا شاہ کریم الحسنی حافظ نام صلوة اللہ علیہ وسلم کے ارشاداتِ گرامی میں اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ ہم اسماعیلی اپنی مروجہ دعا کے معانی و مطالب اور بنیادی حقائق کو بخوبی سمجھ لیا کریں، کیونکہ اس مبارک و مقدس دعا کے الفاظ، اسماء، کلمات اور آیات نہ صرف حقیقی عبادت کے لحاظ سے پُر معزز اور پُر حکمت ہیں، بلکہ یہ اسماعیلی عقیدہ اور نظریہ کے اعتبار سے بھی بنیادی اہمیت کے حامل ہیں، چنانچہ ہم دعا کے اُن اجزاء کی کچھ اساسی حقیقتیں بیان کرتے ہیں، جو آیاتِ قرآن کی صورت میں ہیں۔

حصہ اول

سُورَةُ فَاتِحَةٍ میں نازل ہوئی اور بعض روایتوں کے مطابق مدینہ میں بھی نازل ہوئی، اسی وجہ سے اس کو سبع المثانی کہتے ہیں، چنانچہ سبع کے معنی ہیں سات اور مثانی کے معنی ہیں دہرائی ہوئی، جس سے یہی سُورَةُ فَاتِحَةٍ مراد ہے، کہ اس کی سات آیتیں ہیں، اور یہ دو دفعہ نازل ہوئی ہے، مکہ میں بھی اور مدینہ میں بھی۔

اس سورت کے بہت سے نام ہیں، جیسے سورۃ الحمد، کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کی گئی ہے، سورۃ الفاتحہ، کیونکہ اسی سے قرآن شریف کا آغاز ہوتا ہے، اساس القرآن، کہ یہی کتاب الہی کی بنیاد ہے، سورۃ شفاء، اس کی تاثیر سے روحانی اور جسمانی شفاء حاصل ہوتی ہے، سورۃ الکنز، چونکہ یہی سورۃ قرآن پاک کے سارے علوم کا خزانہ ہے، اور اتم الکتاب یا اتم القرآن، چونکہ قرآن شریف کے تمام مضامین اجمالی طور پر اس میں سمویئے گئے ہیں، سورۃ فاتحہ کے نام ان کے علاوہ اور بھی ہیں، جن سے اس سورت کی عظمت و فضیلت ظاہر ہوتی ہے۔

سورۃ فاتحہ میں خداوندِ عالم نے اپنے بندوں کو بطریقِ جامع ضروری امور کی تعلیم دی ہے، بالفاظِ دیگر یہ سورت قرآن پاک کی تمام حقیقتوں کا سرچشمہ اور ساری حکمتوں کا خزانہ ہے، یہی سبب ہے، کہ اس کے ناموں میں سے ایک خاص نام اتم الکتاب یا اتم القرآن ہے، جس کے معنی ہیں کتابِ اصل یا کہ قرآن کی اصل (ORIGIN)۔

حصہ دوم

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے
 ﴿آیۃ اطاعت﴾ آپ نے فرمایا، کہ پروردگارِ عالم نے "يَا أَيُّهَا
 الَّذِينَ آمَنُوا" (اے ایمان والو!) فرما کر قیامت تک کے مومنین سے یعنی
 ہر زمانہ کے مومنین سے خطاب کر کے فرمادیا ہے کہ: "أَطِيعُوا اللَّهَ وَ"

أَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ (۲۰۹) یعنی اسے ایمان والو! تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور تم میں سے جو صاحبان امر ہیں ان کی اطاعت کرو۔

امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ، اس کیت کہ یہ میں اللہ و رسول کی اطاعت کے بعد جن صاحبان امر کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، وہ ہم آئمہ اہل بیت ہی ہیں۔

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "وَكُلِّ شَيْءٍ بِرَأْيِ حَٰصِنَةٍ فِي إِمَامٍ مُّبِينٍ (۲۳۶) اور ہم نے ہر چیز کو امام مبین میں جمع کر رکھا ہے۔"

(ب) امام مبین

جناب امام محمد باقر علیہ السلام سے بروایت اپنے والد ماجد و جید امجد کے منقول ہے، کہ جب جناب رسول خدا پر یہ آیت نازل ہوئی تو اصحاب میں سے چند حضرات اپنی اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے اور عرض کر نے لگے، یا رسول اللہ آیا امام مبین سے مراد تو ریت ہے؟ فرمایا نہیں، انہوں نے عرض کی، پھر انجیل ہے؟ فرمایا نہیں، پھر انہوں نے عرض کی، آیا قرآن ہے؟ فرمایا نہیں، اتنے میں جناب امیر المومنین مولانا علی تشریف لے آئے، انحضرت نے فرمایا: دیکھو وہ امام جس میں خدائے تعالیٰ نے ہر چیز کے علم کا احصا فرمادیا یہ ہے۔

جناب امیر المومنین علیؑ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا، کہ خدا کی قسم وہ امام مبین میں ہوں، میں حق و باطل کو صاف صاف بیان کر دیتا ہوں،

اور میں نے یہ عہدہ جناب رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وثرتاً پایا ہے۔
 (بحوالہ تفسیر صافی و تفسیر عمدة البیان وحاشیہ ترجمہ قرآن از مقبول احمد
 صاحب)۔

حمت سوم

امر ولایت

جب مذکورہ بالا آیت اطاعت کے ذریعہ خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کے بعد صاحب امر یعنی امام وقت کی اطاعت فرض کی گئی تو لوگ نہ سمجھ سکے، کہ ولایت کیا ہے، ہر چند کہ رسول اللہ مختلف موقعوں پر مولانا علی علیہ السلام کی ولایت کے متعلق لوگوں کو سمجھا دیا کرتے تھے اور یہ کام نزول وحی کے آغاز ہی سے جاری تھا، جیسے آنحضرت نے فرمایا کہ مجھ سے علیؑ کو وہی درجہ ہے جو موسیٰ سے ہارون کو تھا، پھر بھی لوگ علیؑ کی ولایت سمجھنے سے قاصر رہے، اس وقت پروردگار عالم نے آنحضرت کو یہ حکم دیا کہ آپ امت کو ولایت کا مفہوم بھی اس طرح سمجھا دیں، جس طرح کہ آپ نے دوسرے امور کی صورت و کیفیت سے واقف کیا، تو اس وقت آپ کا دل بیٹھ گیا، اور آپ کے دل میں یہ خوف پیدا ہوا، کہ کہیں خدا نخواستہ لوگ آپ کے دین سے مڑ نہ ہو جائیں، اور آپ کی نبوت کی تکذیب نہ کر بیٹھیں، اس اندیشہ کی وجہ سے آپ امر ولایت کے متعلق دوبارہ رب العزت سے مخاطب ہوئے، تو خداوند تعالیٰ نے یہ وحی نازل کی کہ :-

”يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ ۗ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ۗ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۗ“
 ترجمہ: اے رسول جو کچھ (امیر ولایت کے بارے میں) آپ کے رب کی نبیاً سے آپ پر نازل کیا گیا ہے، آپ اس کو پہنچا دیجئے، اور اگر آپ ایسا نہ کریں گے تو آپ نے اللہ تعالیٰ کا ایک پیغام بھی نہیں پہنچایا، اور اللہ تعالیٰ آپ کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔“

پہنچانے والے شخص حضرت صلعم نے امیر الہمی کو ظاہر کر دیا، اور مقام غدیر خم میں امیر المؤمنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی ولایت و امامت کا اعلان کر دیا، آپ نے پہلے تو اس پیغام کو پہنچانے کے لئے ”المشلولۃ جامعہ“ کی نذر دوائی، اور آپ نے یہ حکم جاری فرمایا کہ جو حاضر ہے وہ اس پیغام کو غائب تک پہنچا دے۔

حصہ چہارم

بیعت رضوان

ہجرت کے چھٹے سال میں صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیک وقت چودہ سواصحاب سے، جو اس وقت حاضر تھے، بیعت لی، اس کے بعد سورہ فتح نازل ہوئی جس میں بعض دوسرے امور کے ساتھ بیعت کی حقیقت و حکمت کے بارے میں بھی ارشاد ہے۔

”اے رسول! جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے ہیں، تو وہ (واقع میں) اللہ تعالیٰ سے بیعت کر رہے ہیں، خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے پھر (بیعت کے بعد) جو شخص عہد توڑے گا، تو اس کے عہد توڑنے کا وبال اسی پر پڑے گا، اور جو شخص اس بات کو پورا کرے گا جس پر (بیعت میں) خدا سے عہد کیا ہے سو عنقریب خدا اس کو بڑا اجر دے گا۔“ ۴۸

اس بیعت کے متعلق حق تعالیٰ نے خوشنودی کا اظہار فرمایا، اسی لئے اس کو بیعت رضوان کہتے ہیں، چنانچہ ارشاد ہے کہ: **لَقَدْ وَحَّيْنَا لِلَّهِ الْعَرَبِيَّةِ اِذْ يَبَايَعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ ۚ يَقِينَا** اللہ تعالیٰ مومنوں سے راضی ہو گیا، جس وقت کہ انہوں نے درخت کے نیچے آپ سے بیعت کی۔“

آیہ بیعت کی مذکورہ تعلیم سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہوئی کہ مومنین دین اسلام کی حفاظت کے لئے اپنے آپ اتفاق و اتحاد کے رشتے میں منسلک ہرگز نہیں ہو سکتے، بجز آنکہ وہ ایک ایسی مقدس ہستی کے مبارک ہاتھ پر بیعت کریں، اور اس سے ہمیشہ وابستہ رہیں، جس کو حق تعالیٰ نے اپنی رحمت سے مومنین کے لئے حقیقی اتحاد کا مرکز قرار دیا ہے، جس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ ہے، جس سے بیعت کرنا خدا سے بیعت کرنا ہے، اور جس کا فرمان ماننا خدا کا فرمان ماننا ہے، اور ایسی پاک ہستی صرف پیغمبر اور امام علیہما السلام ہی کی ہے۔

چنانچہ اسماعیلی مذہب کا یہ عقیدہ ایک زندہ حقیقت کی حیثیت سے

ہے کہ مومنین کی ہدایت کرنے اور ان سے فرمانبرداری اور اتحاد کی بیعت لینے کے لئے آنحضرتؐ کے وصی ہمیشہ دینا میں حاضر اور موجود ہیں، جو محمدؐ و علیؑ کے نور کے حامل اور امام زمانہ کا درجہ رکھتے ہیں۔

حصہ پنجم

امانات

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اے ایمان والو! تم اللہ تعالیٰ اور (اس کے) رسول کی (امانتوں میں) خیانت نہ کرو، اور نہ اپنی امانتوں کی خیانت کرو، حالانکہ تم جانتے ہو۔

اس ارشاد الہی کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ قرآن کے علم و حکمت اور تہہ آہل محمدؐ (یعنی امامت) خدا اور اس کے رسول کی امانتیں ہیں، پس ایمان والوں کو چاہئے کہ وہ ان امانتوں میں خیانت نہ کریں، یعنی وہ ان مقدس امانتوں کے مالک ہونے کا دعویٰ نہ کریں، بلکہ ان کو خدا اور رسولؐ کی ملکیت سمجھیں، چنانچہ قرآن کے متعلق یہ عقیدہ رکھیں، کہ قرآن کے علم و حکمت کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے، اور اس کے رسولؐ جانتے ہیں، اور وصیؐ رسولؐ جانتے ہیں، اور تہہ امامت کے بارے میں یہ عقیدہ رکھیں کہ امامت حضرت محمدؐ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہے، اور آنحضرتؐ کے بعد یہ امانت ان کی آل پاک کی ہے، اور ایمان والوں کو ان امانتوں میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں، پس اس عقیدہ اور تصور کی مثال ایسی ہے،

جیسے خدا اور رسول کی امانتیں ادا کر دی گئیں، اس کے برعکس اگر وہ ان امانتوں میں خیانت کریں، تو گویا وہ خود اپنی ان امانتوں میں خیانت کرتے ہیں جو قرآن اور امامت کے ذریعہ روح الامین کے فیوض و برکات کی صورت میں ان کو مل سکتی تھیں۔

چنانچہ خدا اور رسول کی یہی مقدس امانتیں تھیں جن کے بارے میں آنحضرت نے ان الفاظ میں ارشاد فرمایا کہ: "میں اپنے بعد تمہارے درمیان دو گناہیہ چیزیں چھوڑ دیتا ہوں، خدا کی کتاب (یعنی قرآن مجید) اور میری عترت لیل بیت اگر تم ان دونوں کو پکڑے رہو گے، تو تم میرے بعد ہرگز ہرگز گمراہ نہ ہو جاؤ گے، کیونکہ یقیناً یہ دونوں ایک دوسرے سے ہرگز جدا نہ ہوں گی، یہاں تک کہ یہ دونوں حوض کوثر پر مجھ سے آن لیں۔"

اب معلوم ہوا کہ یہ دونوں گران مایہ چیزیں وہی ہیں جن کو مذکورہ بالا آیت میں خدا و رسول کی امانتیں کہا گیا ہے، اور یہ دونوں مقدس چیزیں امانت اس معنی میں ہیں کہ ملکیت جسکی ہو اس کو اختیار ہے کہ وہ جیسا چاہے استعمال کرے، مگر امانت میں اس کے پاس ہو اس کا فریضہ ہے کہ صاحبِ امانت سے یہ بات پوچھ لیا کرے کہ، اس امانت کا مقصد و منشاء کیا ہے، اس سے کس طرح فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، اور اس کی کیا کیا شرطیں ہیں۔

حصہ ششم

سورہ اخلاص

سورہ اخلاص مکہ یا مدینہ میں نازل ہوئی اور اسکی چار آیتیں ہیں، اخلاص

کے معنی کسی چیز کو آمیزش اور ملاوٹ سے خالص اور پاکیزہ کرنے کے ہیں، چنانچہ اس سورتہ میں توحید کو شرک اور دہریت کی آمیزش سے خالص اور پاکیزہ کرنے کی تعلیم دی گئی ہے، اس لئے اس کو سورۃ اخلاص کہتے ہیں، اس اہمیت کی بنا پر اس کو قرآن پاک کی تمام تعلیمات کا خلاصہ اور نتیجہ کہا گیا ہے۔

حضرت امام جعفر الصادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ یہودیوں نے رسول خدا سے پوچھا، کہ تم اپنے پروردگار کا نسب بیان کرو، اور انہوں نے تین بار یہی پوچھا، لیکن حضرت جواب نہیں دیتے تھے، یہاں تک کہ جبرئیل یہ سورۃ لے کر آئے۔

سورۃ اخلاص کا مقصد اللہ تعالیٰ کی وحدانیت (یکتائی) کا مفہوم سمجھانا ہے، اور وہ نظریہ وحدت الوجود کے مطابق درست ہے، یعنی یہ عقیدہ رکھنا کہ ساری موجودات و مخلوقات کی حقیقی ذات ایک ہے جو خدا کے نور اور رحمت میں مستغرق ہے، اور اس تصور کی مدد سے یہ حقیقت سمجھ لینے کی کوشش کرنا، کہ کوئی چیز خدا کی قدرت و حکمت سے خالی نہیں، اب اگر یہ معلوم ہو جائے کہ ہر چیز میں خدا کی قدرت و حکمت موجود ہے تو لازمی ہے کہ تمام مظاہر قدرت کو ایک مان لیا جائے، اور قدرت کو قادرِ مطلق سے جدا نہ سمجھا جائے، چنانچہ حضرت مولانا امام سلطان محمد شاہ صلوٰۃ اللہ علیہ کا ارشادِ گرامی ہے، "کہا جاتا ہے کہ ہم سب خدا میں رہتے ہیں، خدا میں حرکت کرتے ہیں، ہمارا وجود خدا میں ہے" نیز فرماتے ہیں کہ "خدا کے ارادہ اور اس کے منشاء کے باہر کوئی شے اور کوئی وجود نہیں۔"

تاویل استرجاع

یعنی

قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ کی تاویل

(از وجہ دین کلام ۲۹)

ہم خدائے تعالیٰ کی توفیق سے بیان کریں گے کہ لوگوں کو جسمانی حالت میں مصیبت اور مشکلات آتے وقت اس قول کا کہنا واجب ہے، جیسا کہ خدائے تعالیٰ فرماتا ہے: **الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ** ط ۱۵۶ وہ لوگ جن پر جب کوئی مصیبت آ پڑتی ہے، تو کہتے ہیں کہ ہم خدا ہی کے ہیں اور اسی کی طرف واپس ہو جانے والے ہیں۔ عرب والے مشکل کاموں کو رات کی تاریکی سے تشبیہ دیتے ہیں، اس لئے کہ اس کام سے بڑھ کر اور کوئی مشکل نہیں، جس کے گھر سے نکل جانے کا راستہ ہی لوگوں کو نظر نہ آئے، یہی تو تاریکی ہے، تاریکی دو طرح کی ہے، جسمانی تاریکی اور روحانی تاریکی، جسمانی تاریکی کی وجوہات ہے، جسے سورج ہی روشن کر سکتا ہے، کیونکہ جسمانی تاریکی تو اسی سے روشن

ہو سکتی ہے ، اور وہ (سورج) جسمانی رکاوٹوں کو ختم کر ڈالتا ہے ، لیکن روحانی تاریکی نادانی اور معقولات کے مشکل مسئلے ہیں ، اس قسم کی تاریکی کے لئے روشنی خدا سے ہے ، جو اساس (یعنی علی) کی وساطت سے آتی ہے ، اس کے بعد روحانی ظلمت میں چشمِ باطن (بصیرت) کا سورج امام الزمان ہیں ، جن کے سہارے ایسے سخت عقوڈے کھل جاتے ہیں ، جب کوئی جسمانی ظلمت (مصیبت) اور سختی کسی کے سامنے آئے تو اُسے واجب ہے کہ مشیتِ ایزدی کے لئے راضی ہو جائے ، اور جو کچھ اس کے لئے حکم ہوا ہو اسے قبول کرے ، اور کہے : **اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ** یعنی ہم خدا کے ہیں ، اور ہم نے قبول کر لیا ، جو کچھ اس نے حکم کیا ہو ۔ اگر ان مشکلات سے ہمیں کوئی ایسی جسمانی تکلیف پہنچے جس کی وجہ سے ہم جسمانی طور پر مر جائیں ، تو اس صورت میں ہم اس کی طرف واپس ہونے والے ہیں ، اور تاویل میں مومن کو واجب ہے کہ جب معقولات کا کوئی ایسا مسئلہ اس کے سامنے آجائے جس کو وہ حل نہیں کر سکتا ہو ، تو پھر اسی قول کو دہرائے ، اس طریقہ پر (یعنی اس معنی میں) کہ ”ہماری جانتیں صاحب العصر کی ہیں ، کیونکہ ہمیں روحانی زندگی اسی سے ملی ہے ، اور مشکلات میں ہم اس کی طرف رجوع کرنے والے ہیں ، نیز وہ مومن یہ سمجھے کہ ”ہم اس مشکل مسئلے کو حل نہیں کر سکتے ہیں ، اس کا علم امام زمان کے پاس ہے ،“ تاکہ اس کیلئے روحانی فیض کا دروازہ کھلے ، اور ان مشکلات کو سمجھ سکے ، اور وہ غیب اس پر کھلے گا ، اور اگر کھل نہ جائے تو یہ اپنی ہی کمزوری سمجھے ، اور اقرار کرے ، کہ جو شخص ایسی مشکلات کا چارہ جانتا ہو ، اسے یہ

زیب دیتا ہے کہ روحانی مشکلات میں لوگ اسی کی طرف رجوع کریں، اور یہ صرف مومن ہی کے لئے ایک شفا بخش بیان ہے۔ والسلام

مذکورہ بالا آیت کی تاویل کی تحقیق :

تاویل کا دوسرا نام حکمت ہے، اور حکمت کا سمجھ لینا عوام کے لئے کوئی آسان بات نہیں، چنانچہ پیر حکیم ناصر خسرو قدس اللہ سرہ نے مذکورہ بالا آیت کی تاویل بیان فرمائی ہے، ہم ذیل میں اس کے اصولات کو ظاہر کر کے دکھاتے ہیں :

”قَوْلُهُ تَعَالَى ۱- وَتَبَلَّغُوا نَفْسَكُمْ بِرَبِّكُمْ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصِ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالشَّجْوَاتِ ط وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ط وَأُولَئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِنْ رَبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ط“

ہم تمہیں کچھ خوف اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے ضرور آزمائیں گے، اور (اے رسول) ایسے صبر کرنے والوں کو کہ جب ان پر (ان مصیبتوں میں سے) کوئی مصیبت آپڑی تو وہ (بے ساختہ) بول اٹھے کہ ہم تو خدا ہی کے ہیں، اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں، خوشخبری دے دو کہ انہیں لوگوں پر ان کے پروردگار کی طرف سے صلوات اور رحمت ہیں، اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔“

مذکورہ ارشادِ الہی کی تعلیم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنوں سے ضرور امتحان لینے والا ہے، فرمایا گیا ہے کہ اس امتحان و آزمائش کی پانچ قسمیں

ہیں، جن میں سے ہر ایک قسم کے روحانی و جسمانی دو در پہلو ہیں، چنانچہ پہلا امتحان خوف کا ہے جس میں جسمانی اور روحانی قسم کے تمام خوف و ہراس شامل ہیں، دوسرا امتحان بھوک کا ہے جس میں روحانی اور جسمانی غذاؤں کی کمی کا ذکر ہے، تیسرا امتحان مالوں کی کمی کے متعلق ہے، جس میں روحانی اور جسمانی دونوں قسم کے مالوں کا ذکر ہے، چوتھا امتحان نفوس کی کمی کے بارے میں ہے، جس میں نفوسِ قدسیہ اور نفوسِ بشریہ دونوں قسم کا بیان ہے، اور پانچواں امتحان پھلوں کی کمی کے باب میں ہے، جس میں روحانی اور جسمانی دونوں قسم کے پھلوں کا تذکرہ ہے۔

اب ان پانچ قسم کے امتحاناتِ الہیہ کے روحانی پہلوؤں کے بارے میں سنئے کہ جس طرح مومن اپنے جسم کو تکلیف پہنچ جانے، اس کے ذلیل و خوار ہو جانے اور ہلاک ہو جانے کا خوف رکھتا ہے، اسی طرح وہ اپنی رُوح کو ایذا پہنچنے، اس کے خوار و رسوا ہو جانے اور فنا ہو جانے سے بھی ڈرتا ہے، پس ثابت ہوا، کہ خوفِ روحانی و جسمانی دو قسم کا ہے، اس کے بعد بھوک کا ذکر ہے، چنانچہ جسمانی بھوک جسم کے لئے غذا کی ضرورت محسوس ہونے کا نام ہے، اور روحانی بھوک رُوح کے لئے غذا کی ضرورت محسوس ہونے کا نام ہے، اور روحانی غذا عبادت و معرفت ہے، اس کے بعد مال کا ذکر ہے، ظاہری مال کی کمی یہ ہے کہ اس میں جسمانی ضروریات فراہم نہیں ہوتیں، اور باطنی مال کی کمی یہ ہے کہ اس میں روحانی ضروریات پوری نہیں ہوتیں، اور روحانی ضروریات علمِ حقیقت سے پوری ہو جاتی ہیں، اس کے بعد پھلوں کا ذکر ہے، ظاہری پھل یہی ہیں جو

درختوں سے حاصل ہوتے ہیں، اور باطنی پھل وہ ہیں، جو علم و دانش کے درختوں سے حاصل ہوتے ہیں، علم و دانش کے نعت امام زمان اور اس کے حدود ہیں، جو کلماتِ تامہ اور اسماء الحسنیٰ کی صورت میں مومنین کے قلب و روح میں موجود ہیں، اور ان روحانی درختوں کے پھل تاویل اور حکمت کی صورت میں پائے جاتے ہیں۔

پس جس مومن کو ان پانچ قسم کی جسمانی مصیبتوں ہی کی طرح ان پانچ قسم کی روحانی مصیبتوں کا بھی احساس ہو جائے، یعنی جب وہ روحانی قسم کا خوف محسوس کرنے لگے، جب روحانی مجھ کو یعنی عبادت و معرفت کی کمی محسوس کرے، جب اپنے آپ میں روحانی مال یعنی علم حقیقت کی کمی محسوس کرے جب نفوسِ قدسیہ تک رسا نہ ہو سکنے سے سخت پشیمان ہو جائے، اور جب تاویل و حکمت سے قاصر رہ جانے کا احساس کرے، تو اسے گھبرانانا نہیں چاہئے بلکہ عزم و ارادہ اور صبر سے کام لیتے ہوئے یہ قول کہنا چاہئے:-

”إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ“: ہم خدا ہی کے ہیں، اور ہم اسی کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔ اس قول کی ایک حکمت یہ ہے کہ مومنین خدا کے ہیں، اور خدا مومنین کا ہے، چنانچہ ارشادِ نبوی ہے: ”مَنْ كَانَ لِلّٰهِ كَانَ اللَّهُ لَهُ“ جو شخص خصوصیت کے ساتھ خدا کا ہو جائے، تو خدا بھی شخصیت کے ساتھ اسی کا ہو جاتا ہے۔“

پس ایسا مومن نہ صرف جسمانی موت کے بعد خدا کی طرف رجوع کرتا ہے، بلکہ وہ اس زندگی میں بھی خدا کی طرف رجوع کر سکتا ہے، وہ اس طرح کہ جب

مومن پر کوئی جسمانی یا روحانی مصیبت آپڑتی ہے تو اس کی نفسانی خواہشات اور حیوانی صفات کچھ وقت کے لئے یکسر خاموش ہو بیٹھتی ہیں، جن کی وجہ سے وہ مومن اُس وقت اس قابل ہو جاتا ہے، کہ امام زمان علیہ السلام اور ان کے حدود کے ذریعہ خدا لئے تعالیٰ سے صلوات، رحمت اور ہدایت حاصل کر سکے، پس حقیقی مومن کو چاہئے کہ روحانی یا جسمانی مصیبت کے پیش آتے وقت یہ قول کہا کرے، اور اس کے معنی و تاویل کو اسی طرح ہی سمجھے اور اس پر عمل کرے۔

جب حقیقی مومن یہ قول کہتا ہے، اور اس کے حقائق کو سمجھ لیتا ہے، اور ان پر عمل کرتا ہے، تو وہ ان صبر کرنے والوں میں سے ہو جاتا ہے، جن کو حضرت رسول علیہ السلام عملی طور پر خوشخبری سناتے ہیں کہ انہیں لوگوں پر ان کے پروردگار کی طرف سے صلوات اور رحمت ہیں، اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔

تفسیر عمدة البیان میں حضرت امام جعفر الصادق سے روایت ہے کہ فرمایا رسول خدا صلعم نے کہ جو کوئی چار چیزوں پر عمل کرے، وہ شخص البتہ بہشتیوں میں سے ہو، اول کہنا لا اِلهَ اِلَّا اللهُ، اور دوسری یہ کہ اگر کوئی نعمت حاصل ہو تو کہے کہ الحمد للہ، اور تیسری یہ کہ اگر کوئی گناہ کرے، تو کہے کہ اَسْتَغْفِرُ اللهَ اور چوتھی یہ کہ جس وقت کوئی مصیبت پہنچے تو کہے، کہ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رٰجِعُونَ

اس جیسی روایات تفسیر صافی اور کتاب دعائم الاسلام جلد اول ص ۲۲۳-۲۲۴ میں بھی پائی جاتی ہیں۔

ہمتِ مردانِ مددِ خدا

تائیدِ الہی ہے سدا ہمتِ مردان
 مشکل ہی سہی مستدل مقصود کی راہیں
 ہے باعثِ انعامِ خدا ہمتِ مردان
 ہے سہل جو ہو راہِ نما ہمتِ مردان
 ہو جاتے اگر نورِ ہدی ہمتِ مردان
 دیکھو گے سدا قلعہ کُشا ہمتِ مردان
 اللہ کا ہے جو دعو عطا ہمتِ مردان
 دیتی نہ اگر اس کو جگا ہمتِ مردان
 ہوتی نہ اگر جلوہ فزا ہمتِ مردان
 دیتی نہ اگر بانگِ راہ ہمتِ مردان
 تم بھی تو بڑھو کہنے راہ ہمتِ مردان
 کر لو گے طلب کر کے دعا ہمتِ مردان
 ہر درد کی ہے تو ہی دوا ہمتِ مردان
 جو غنچہ کھلا تجھ سے کھلا ہمتِ مردان
 تجھ ہی سے گئے سوتی سما ہمتِ مردان
 لا ریب کہ وہ تجھ سے ہوا ہمتِ مردان
 آسان ہے ظلماتِ حوادث سے گزرا
 اقوام کے اس معرکہ علم و عمل میں
 گنجینہ اقبال و سعادت تو یہی ہے
 کب جاگتی تعمیرِ جہان خوابِ عدم سے
 یہ رونق تہذیب تمدن بھی نہ ہوتی
 معشوقِ ہنر بزمِ ثقافت میں نہ آتا
 ہمت سے گئے اہل ہنر سوتے کمالا
 سمجھو گے اگر معجزہ ہمتِ مردان
 اے ہمتِ مردان کہ تو ہے دمِ عسی
 اس گلشنِ امید میں تو موسمِ گل ہے
 سرمایہ ایجاد ہے تو روتے زمین پر
 ہر عارفِ کامل جو ہوا واصلِ یزدان

ہمت سے ہوتے جو بھی ہوتے زندہ جاوید مانا کہ تو ہے اب بقا ہمتِ مردان
 وہ عقدہ مشکل کہ نہ کھلتا تھا کسی سے فی الفور وہ تجھ ہی سے کھلا ہمتِ مردان
 ہمت کے ترانے ہیں یہ اشعارِ نصیری خود آ کے ہوئی نغمہ سرا ہمتِ مردان

مرقوم ہے بس صفحہ عالم پہ یہی قول
 ”تائیدِ الہی ہے سدا ہمتِ مردان“

Institute for
 Spiritual Wisdom
 and
 Luminous Science
 Knowledge for a united humanity

توحید

”توحید“ ایک عربی لفظ ہے، جس کے معنی ہیں ایک ہونا، ایک بنانا، ایک ماننا اور ایک تصور کرنا اور اس کے اصطلاحی معنی ہیں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت و یکتائی کا اقرار و اعتقاد، یعنی خدائے واحد پر ایمان لانا، اور اس کی وحدت کا قائل ہونا، یہ تو صرف توحید کی لفظی تخیل ہوئی، اب یہ دیکھنا ہے کہ اس لفظ کے معنی سے خدا کی جو یکتائی مراد ہے، وہ آپ کو کس طرح سمجھائی جاسکتی ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں اہل تصوف کے نظریے سے کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں :-

توحیدِ مطلب :

صوفیائے کرام کے نزدیک ”توحیدِ مطلب“ یہ ہے کہ مرید پوری تابعداری اور سچی محبت کے وسیلے سے اپنے پیرومرشد کے ساتھ وابستہ ہو جائے، رشد و ہدایت حاصل کرنے کے لئے کسی دوسرے شخص کی طرف ہرگز توجہ نہ کرے، اور رفتہ رفتہ اپنی تمام خواہشات کو اپنے مرشد کی خوشنودی میں فنا کر دے، یہ ہوئی ”توحیدِ مطلب“ یعنی ذریعہ ہدایت کے ساتھ اپنے آپ کو ایک کر دینا۔

توحید و جود ہی :

توحید و جود ہی یا وحدت الوجود کے معنی ہیں تمام ہستی کو ایک ماننا، یعنی یہ عقیدہ رکھنا کہ ساری موجودات و مخلوقات کی حقیقی ذات ایک ہے، جو خدا کے نور اور رحمت میں مستغرق ہے، اور اس تصور کی مدد سے یہ حقیقت سمجھ لینے کی کوشش کرنا کہ کوئی چیز خدا کی قدرت و حکمت سے خالی نہیں، اب اگر یہ معلوم ہو جائے، کہ ہر چیز میں خدا کی قدرت و حکمت موجود ہے تو لازمی ہے کہ تمام مظاہر قدرت کو ایک مان لیا جائے، اور قدرت کو قادرِ مطلق سے جہاں سمجھا جائے، چنانچہ جامی صاحب کی یہ رباعی اسی مطلب کی ترجمانی کرتی ہے:

مجموعہ کونین بقانونِ سبق
 کرویم تغمض درقا بعد درق
 حقا کہ ندیدیم و نخوا ندیم درو
 جز ذات حق و شیون ذاتیہ حق

ترجمہ، ہم نے درس کے اصول پر دونوں جہان کی کتاب کے اوراق کو تحقیق و تجسس سے پڑھ لیا، خدا کی قسم ہم نے اس میں حق تعالیٰ کی ذات اور (علمی مراتب کے مطابق) اس کے مختلف ظہورات کے سوا اور کوئی شے کو نہیں دیکھا۔

توحیدِ عیانی :

جب کوئی خاص بندہ خدا کے نور کی قربت حاصل کر کے اپنی صفات کو خدا کی صفات میں فنا کر دیتا ہے تو اس کی خودی خدا کی تجلیوں میں گم ہو جاتی ہے ایسے میں بعض عارف انا الحق (میں خدا ہوں) جیسا کوئی نعرہ بلند کرنے لگتے ہیں، یہ مقام فنا فی اللہ و بقا باللہ کہلاتا ہے، یعنی اپنی صفات سے فنا ہو کر خدا کی صفات میں زندہ ہو جانا۔

توحید کی مذکورہ مثالوں سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ جس طرح کثرت وحدت ہی سے پیدا ہوئی تھی، اسی طرح یہ رفتہ رفتہ وحدت ہی میں فنا ہونے والی ہے، جیسا کہ حق تعالیٰ کا فرمان ہے: **كُلُّ مَنْ عَمِلْهَا قَانَ ط وَ يَمُتْ وَ جَهْدَ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ط قِيَاسِي الْآلَاءِ رَمِيمًا تَكْتَبَانِ ط** ۵۵/۲۸-۲۹ یعنی سب جو اس زمین پر ہیں فنا ہونے والے ہیں، اور باقی رہے گی آپ کے پروردگار صاحب جلال و احسان کی ذات، پس تم دونوں (جن والنس) اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ ظاہر ہے کہ یہ فنا وہی ہے جس کا اوپر ذکر ہوا، یعنی فنا فی اللہ و بقا باللہ، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فنا بھی حق تعالیٰ کی عظیم نعمتوں میں سے ہے۔ رسول اللہ کا ارشاد گرامی ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے دین کو اپنے خلق کی طرح بنایا، تاکہ اس کی خلق سے اس کے دین کا استدلال کیا جاسکے، اور اس کے دین سے اس کی وحدانیت کا استدلال کیا جاسکے۔

خلق سے دینِ حق کی دلیل :

کائنات و مخلوقات سے دینِ حق کی دلیل یہ ہے کہ آسمانوں اور ستاروں کے اثرات عناصر میں تحلیل ہو جاتے ہیں، عناصر سے نباتات اگتی ہیں، نباتات سے حیوانات کی پرورش ہوتی ہے، حیوانات کے قائد سے انسانوں کو پلٹتے ہیں، یا یوں کہنا چاہئے کہ اس ترتیب میں ہر مخلوق اپنے سے برتر مخلوق میں فنا ہو کر ایک اعلیٰ قسم کی ہستی میں بدل جاتی ہے۔

دینِ حق سے خدا کی وحدانیت کی دلیل :

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے ”اور تم سب مل کر اللہ تعالیٰ کی رسی (ولایت) کو مضبوطی سے پکڑے رہو، اور متفرق نہ ہو، اور یاد کرو اللہ تعالیٰ کی نعمت کہ جو تم پر ہے، جبکہ تم (ایک دوسرے کے) دشمن تھے پس اسی نے تمہارے دلوں کے درمیان الفت ڈال دی، پھر تم اس کی نعمت کے طفیل بھائی بھائی ہو گئے۔“

اس ارشادِ الہی میں یہ حکمت پوشیدہ ہے کہ لوگ قبولِ اسلام سے قبل ایک دوسرے کے دشمن تھے، خدا اور رسولؐ نے دینِ حق کی نعمت سے (جو ایک ہی ماں کے دودھ کا درہم رکھتی تھی) ان کو بھائی بھائی بنایا۔ اب اس نعمت کے بعد ان کو ایک ایسی عظیم اور بے مثل نعمت کی طرف بلایا جاتا ہے، کہ جس سے وہ ایک جان کے مانند ہو سکتے ہیں،

کیونکہ وحدت کے سلسلے میں بھائی بھائی ہونے کے بعد ایک جان کے مانند ہو جانا ضروری ہے، چنانچہ رسول اللہ کا ارشاد ہے :

”إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ وَالْأَنْبِيَاءُ (وَأَوْلِيَاءُ) أَيْ كَنَفْسٍ وَوَأَحَدَةٍ : یعنی مومنین بھائی بھائی ہیں، اور انبیاء (و اولیاء) ایک جان کے مانند ہیں پس جانا چاہئے کہ سب سے بڑی قیامت برپا نہیں ہوگی، جب تک کہ مومنین ایک جان کے مانند ہو کر یک دلی اختیار نہ کریں، چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

”وَمَا خَلَقَكُمْ وَلَا نَعْتُكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَوَأَحَدَةٍ ۚ۱۸۸۔ اور نہیں تمہاری (ازلی) پیدائش اور بعثت (یعنی مر کر پھر زندہ ہو جانا) مگر ایک جان کے مانند“ یعنی جس طرح تم ازل میں ایک جان کی طرح پیدا کئے گئے تھے، اسی طرح وحدت کے مقام پر بھی تم آخر کار ایک ہو جاؤ گے۔

پس دین حق میں خدا کی وحدانیت کی دلیل و مثال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام انبیاء، اولیاء، اور مومنین کی وحدت کا مرکز ہیں، اور آنحضرتؐ کا فخر امامِ حق و حاضر کے لباس میں تا قیامت جلوہ گر ہے۔

شاہ! سلامٌ علیک

نام ہے تیرا کریم شاہ سلامٌ علیک

شان ہے تیری عظیم شاہ سلامٌ علیک

تیرے سوا کون ہے آلِ تہیٰ و عسیٰ

تو رہِ خدا کے حکیم شاہ سلامٌ علیک

ذکرِ خفیٰ بن کے آ دیدہ و دلِ فرشِ راہ

مالکِ ملکِ قدیم شاہ سلامٌ علیک

باغ و چین کی بہار سر و سمن کا نکھار

تو ہے گلوں کی شمیم شاہ سلامٌ علیک

برقِ تجلیٰ، طورِ حُسنِ خدا کا ظہور

تو رہِ چشمِ کلیم شاہ سلامٌ علیک

مصحفِ تاطق ہے تو علمِ لدُنِ تجھ سے ہے

تو ہی الف لام میم شاہ سلامٌ علیک

تابشِ دیدار سے ظلمتِ غم ڈھل گئی

تیرے کرم سے کریم شاہ سلامٌ علیک

منظہر نورِ خدا آئینہِ ماسخ
مصدرِ لطفِ عمیم شاہِ سلامُ علیک

تیری محبت سے میں دیکھ کے پامال ہوں
رسم کر اے بورِ حمیم شاہِ سلامُ علیک

عشق کا ہوں میں قتلِ نغمہٴ جان بخش بھیج
ہمدرہ بادِ نسیم شاہِ سلامُ علیک

تجھ سے شفا پاگئے درِ دیہات سے ماں
ہم جو ہوتے تھے سقیم شاہِ سلامُ علیک

پیکرِ نورِ خدا تو ہی تو ہے رہنما
سوئے رہِ مستقیم شاہِ سلامُ علیک

مطلعِ رحمت ہے تو گوہرِ حکمت ہے تو
تو ہے جسور و حلیم شاہِ سلامُ علیک

کون ہے تجھ سا شفیع ہم یہاں اور ماں
حامی و یارِ حمیم شاہِ سلامُ علیک

اس دلِ دیران میں آ کہ وہ آباد ہو
چونکہ ہے تیرا حریم شاہِ سلامُ علیک

وصل ہے گویا بہشتِ راحتِ جان سے بھری
بجرا عذابِ الیم شاہِ سلامؑ علیک

نقطۂ بسمل میں ہے عارفِ حق کے لئے

ایک کتابِ ضعیف شاہِ سلامؑ علیک

معجزۂ عشق سے مُردہ دلوں کو جلا

کون ہے تجھ سا حکم شاہِ سلامؑ علیک

جب سے کہ آیا نصیر تیری غلامی میں بس

ہے ترے در پر مقیم شاہِ سلامؑ علیک

Luminous Science

Knowledge for a united humanity

توضیح الفاظ

شاہِ اسلام علیک = اے بادشاہِ انجمن پر سلام ہو!

حکیم کے معنی ہیں حکمت والا۔

ذکرِ حقی وہ ذکر ہے جو نہایت ہی پوشیدگی اور آہستگی سے دل میں کیا جاتا ہے۔

دیدہ و دل فرسِ راز کا مطلب ہے = میری آنکھیں اور دل تیری راہ کا فرس بن جائیں۔

مالکِ ملکِ قدیم = قدیم سلطنت کا مالک۔

شمیم کے معنی ہیں خوشبودار ہوا، خوشبو اور مہک۔

تجلّٰی طُور سے اللہ تعالیٰ کی وہ جلوہ نمائی مراد ہے، جو اس نے سیناء

کے پہاڑ پر ظاہر فرمائی تھی۔

کَلِم کے معنی ہیں کلام کرنے والا، یعنی حضرت موسیٰ جو خدا سے کلام کرتے تھے۔

مُصَحِّفِ ناطق = بولنے والا قرآن۔

عِلْم لَدُن = وہ علم جو بغیر کتاب کے خدا کے حضور سے ملتا ہے۔

الف لام میم (الفر) حروفِ مقطعات جو سورۃ بقرہ کے شروع

میں ہیں، جن میں اسرارِ الہی پوشیدہ ہیں۔

ظلمت = تاریکی۔

آئینہ حق نما، وہ آئینہ جو خدا کا دیدار کر لے۔

مصدرِ لطیفِ عمیم = کثرت اور عمومیت سے مہربانیاں نکلنے کی جگہ۔
پامال = روندنا ہوا۔

بو رحیم = ابو رحیم کا مخفف ہے، مولانا حاضر امام کی کنیت، یعنی رحیم کا باب۔
قتیل = قتل کیا گیا، مُردہ۔

نفعہ جان بخش = زندگی بخشنے والی خوشبو۔

ہمراہِ جاد نسیم = پھلی رات یا صبح کی نرم اور معطر ہوا کے ساتھ۔
سقیم = بیمار۔

پیکرِ نورِ ہدأ = ہدایت کے نور کی صورت یا ہدایت کا مجسم نور۔
مطلع = طلوع ہونے کی جگہ۔

صبور و حلیم = صبر والا اور رحم والا۔
شفیق = شفقت والا۔

یہاں اور وہاں = مراد ہے دُنیا اور آخرت۔

یارِ رحیم = جانی دوست۔

ویرانہ = اُجڑا ہوا۔

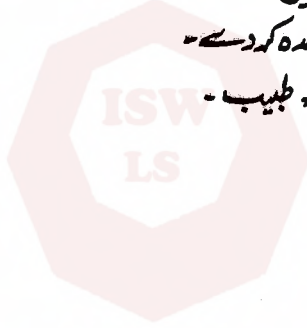
حریم = گھر، مکان۔

وہل = دیدار۔

ہجیر = مُدائی۔

عذابِ الیم = دردناک عذاب۔

نُقْطَةُ بِسْمِلٍ، بِسْمِ اللّٰهِ كَانَتْ نَقْطَةً -
 عَارِفٍ حَقِّقٍ = خُدا کا عَارِف، یعنی خُدا کو پہچاننے والا۔
 مُرَدِّدِ دِلِّ = سُسْت، کابل، اور بے ذوق آدمی۔
 جِلَا = زنده کر دے۔
 حَكِيمٌ = طَبِيبٌ -



**Institute for
 Spiritual Wisdom
 and
 Luminous Science**
 Knowledge for a united humanity

مشاہدہ نور

اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ آیا خدائے تعالیٰ کے نور کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب غیر محدود طریق پر دیا جائے گا، یعنی جواب نفی میں بھی ہوگا، اور اثبات میں بھی، اور اس سوال کا مناسب جواب بس اس طرح سے ہے جیسے سورج کے متعلق یہ کہنا حقیقت ہے، کہ ٹکٹکی باندھ کر زیادہ دیر تک سورج کو نہیں دیکھا جاسکتا، مگر بے شک ایک اچھٹی ہوئی نگاہ سے اسے دیکھا جاسکتا ہے، کیونکہ اگر نظر جما کر زیادہ دیر تک سورج کا مشاہدہ کیا جائے، تو آنکھوں کی بینائی زائل ہو جاتی ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ ہر قسم کی تیز روشنی سے جو کہ نہیں چھوٹی ہیں، وہ اصل میں روشنی کے انتہائی چھوٹے اور باریک ذرات کی مسلسل لہریں ہیں، جن سے آنکھوں کے نازک پردوں کو چوٹ لگتی رہتی ہے، پس اس مادی روشنی کی مثال سے ہر دانش مند اندازہ کر سکتا ہے، کہ جب سورج وغیرہ کی تیز روشنی کا یہ حال ہے، تو خدائے نور کا مہرہ سے حجاب اٹھالینے کا کیا عالم ہوگا۔

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے اولوالعزم پیغمبر نے اللہ تعالیٰ کے پاک نور کی تجلیوں کے سلسلے میں جب سب سے بڑی تجلی کے لئے درخواست کی، تو پروردگار عالم نے فرمایا کہ اے موسیٰ! تم میری تجلی کے لئے متمحل

نہ ہو سکو گے، لیکن اس پہاڑ کی طرف دیکھو، کہ اگر یہ پہاڑ میرے نور کی تجلیوں کو سہارا سکے تو تم بھی البتہ مجھے دیکھ سکو گے، پھر جب پروردگارِ عالم نے پہاڑ پر اپنا جلوہ ظاہر فرمایا تو پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا، اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر گئے، اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ حضرت موسیٰ نے خدائے جمال و جلال کے آسمان کی چمکتی ہوئی بجلی کا ذرا مشاہدہ کیا تھا، یہی وجہ ہے کہ وہ بے ہوش ہو کر گر گئے، ورنہ بے ہوش کیوں ہوتے، اور یہاں پہاڑ سے موسیٰ علیہ السلام کی روحانی ہستی مراد ہے، کیونکہ اس ظاہری پہاڑ پر اللہ تعالیٰ کا جلوہ نکلن ہو جانا مناسب نہیں ہے۔

اس کے علاوہ جب بنی اسرائیل نے احتجاجاً موسیٰ سے یہ کہہ دیا، کہ اے موسیٰ! ہم تیرے لئے ہرگز نہ باور نہیں کریں گے جب تک کہ ہم خدا کو ظاہر نہ دیکھیں، تو موسیٰ علیہ السلام نے ان میں سے ستر مردوں کو چُن لیا، اور یہ سب دیدارِ الہی کی عرض سے کوہِ طور پر گئے، اور وہاں حضرت موسیٰ کے ساتھ ان سب نے گمراہی شروع کی، جس کے نتیجے میں ان کے نفوس پر اللہ تعالیٰ کی نورانیت کی بجلی چمک گئی، جس سے یہ لوگ جسمانی طور پر نہیں بلکہ نفسانی طور پر مر گئے، پھر ایمانی طور پر زندہ ہو گئے، اگر ان لوگوں نے کچھ بھی نہ دیکھا ہوتا تو مر جاتے اور زندہ ہو جانے کا سوال نہ ہوتا۔

جاننا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے نور کے دیدار کے درجات ہو کر تھے ہیں، چنانچہ قرآنِ پاک میں ہے، کہ حضرت موسیٰ نے شروع شروع میں دُور سے ایک آگ جیسی روشنی دیکھی تھی، وہ جب اس روشنی کے قریب گئے، تو روشنی

نے جو درخت پر تھی، فرمایا کہ میں یقیناً اللہ رب العالمین ہوں، پھر اس حال میں حضرت موسیٰ بے ہوش نہیں ہوئے تھے، کیونکہ ابتدائی درجے کا ایک دیدار تھا، اسی لئے اس کی مثال ایک ایسی آگ سے دی گئی ہے جو کسی دُور گاؤں سے یا کسی دُور پہاڑ سے نظر آتی ہے، اور آگے چل کر جو سب سے بڑا دیدار ہے، اس کی مثال بجلی کے کوند نے اور چمکنے سے دی گئی ہے، کیونکہ نور کا آخری دیدار بجلی کے چمکنے سے مشابہ ہے، زیادہ دیر تک مشاہدہ نہ کر سکنے کے لحاظ سے بھی اور جمال و جلال اور ہیبت کے اعتبار سے بھی۔

ہم جن سوال کی تحلیل کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ، آیا خدائے تعالیٰ کے نور کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ جس کا جواب نفی میں بھی اور اثبات میں بھی دیا گیا تھا، اب وضاحت سے یہ حقیقت صاف طور پر روشن ہوئی، کہ بیشک خدا کا نور کسی ایک عالم میں محدود نہیں، وہ سب سے اول بھی ہے اور سب سے آخر بھی، اور سب سے ظاہر بھی ہے، اور سب سے باطن بھی، جیسا کہ قرآن پاک کا ارشاد ہے:-

”هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ“ ۵۰۔ چنانچہ ظاہر کے معنی دکھائی دینے اور نظر آنے کے ہیں، اور باطن کے معنی دکھائی نہ دینے اور نظر نہ آنے کے، اور یہ حقیقت کئی اعتبارات سے درست ہے، اول یہ کہ دنیا بھر کے لوگ دو حصوں پر منقسم ہیں، پہلے حصے کے لوگوں کے اعتقاد کے مطابق خدا حاضر و ناظر ہے، دوسرے حصے کے لوگوں کے بقول کوئی خدا نہیں، پس جو لوگ خدا کی ہستی کے قائل ہیں، ان کے لئے گویا

خدا ظاہر ہے، اور جو قائل نہیں، ان کے لئے باطن ہے، دوم یہ کہ جو لوگ خدا کی ہستی کے قائل ہیں، ان کے بھی دو گروہ ہیں، ایک گروہ کہتا ہے کہ خدا کے دیدار کا مشاہدہ ممکن ہے، دوسرا گروہ کہتا ہے کہ خدا کا دیدار ناممکن ہے، پھر یہاں پر بھی خدا کے ظاہر و باطن ہونے کا ثبوت مل گیا، تیسری مثال یہ ہے کہ جو لوگ دیدار کے قائل ہیں، ان کی بھی دو قسمیں ہیں: ایک قسم دیدار تک پہنچ سکتی ہے، اور دوسری قسم نہیں پہنچ سکتی، پھر جو لوگ دیدار الہی تک رسا ہو جاتے ہیں ان کے بھی دو درجے ہیں، درجہ اول کے لوگ آخری دیدار کا تجربہ کر پاتے ہیں، اور درجہ دوم کے لوگ پچھلے درجات ہی میں رہ جاتے ہیں، اور جو خوش نصیب اعلیٰ ترین دیدار تک پہنچتے ہیں، ان کے بھی دو حال ہوتے ہیں: ایک حال یہ ہے کہ انہیں سب سے بڑے درجے کا دیدار ہوتا ہے، جو خدا کے ظاہر ہونے کی دلیل ہے، دوسرا حال یہ ہے کہ خدا کے نور کی جو کچھ حقیقت ہے، اس کا پورا پورا مشاہدہ نہیں کیا جاسکتا، جو خدا کے باطن ہونے کی دلیل ہے، پس ان تمام مثالوں میں اس حقیقت کے دلائل موجود ہیں کہ خدا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔

اگر یہاں پر کوئی یہ سوال کرے کہ خدا کو یک وقت ظاہر اور باطن ماننا ایسا ہے، جیسے کئی شخص کہتا ہے کہ پانی جب گرم ہے تو اسی وقت سرد بھی ہے، حالانکہ یہ بات ناممکن ہے، کیونکہ جب ہم کسی موجود میں دو متضاد صفتوں کا تصور کرتے ہیں تو منطقی طور پر ان دونوں صفتوں کی خود بخود نفی ہو جاتی ہے، چنانچہ اگر کہا جائے کہ یہ لوط آگ کی طرح گرم ہے تو لوط سے سردی کی صفت کی نفی ہو

جاتی ہے، اور اگر اسی وقت یہ بھی کہا جائے کہ یہ لوہا برف و سنج کی طرح ٹھنڈا ہے، تو اس کی گرمی کی صفت کی نفی ہو جاتی ہے، اور ان دونوں متضاد باتوں کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے، کہ وہ لوہا نہ تو آگ کے مانند گرم ہے، اور نہ سنج کی طرح سرد، پس یہ کیسے ممکن ہے کہ خدا ایک ہی وقت میں ظاہر بھی ہو اور باطن بھی؟

اس کے لئے میرا جواب یہ ہے، کہ منطق اور فلسفہ جیسے ظاہری علوم گلاس بھر پانی اور ایک لوہے کے ٹکڑے پر حکم کر سکتے ہیں، کیونکہ ایسی محدود چیزیں ایک وقت کئی صفات کی حامل نہیں ہو سکتیں، مگر ایک سمندر اور ایک لوہے کے پہاڑ کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے، چنانچہ دنیا بھر کے پانیوں کی وحدت کو ہم پانی ہی کہیں گے، اب یہ فرض کرو، کہ سمندر کہہ رہا ہے۔ یا کہ سارے پانیوں کی مرکزیت و وحدت کہہ رہی ہے، کہ میں گرم بھی ہوں اور سرد بھی میں سمندر بھی ہوں اور بخارات، بادل، برف و بارش اور چشمہ بھی، میں ہندی، نالہ اور دریا کی صورت میں بھی ہوں، اور گھاس پات، فصل، پھل، حیوان اور انسان کی شکل میں بھی، تو کیا پانیوں کی مرکزیت و وحدت کا یہ دعویٰ باطل ہوگا، جبکہ مذکورہ تمام چیزوں میں پانی موجود ہے؟

پس پانی کے مجموعی وجود یا کہ وحدت کے بارے میں یہ تعریف، کہ دنیا تڑپ کے علاوہ عالم نباتات اور عالم حیوانات میں سب کچھ پانی ہے، ہرگز غلط نہیں، اور اگر دنیا بھر کے پانی کی وحدت سے قطع نظر صرف ایک گلاس پانی کی نسبت، ”ہمہ اوست“ کی یہ تعریف کی جائے تو قطعی طور پر غلط اور سراسر تھوٹ ثابت ہوگی۔

پھر یہ مطلب صاف طور پر ظاہر ہوا، کہ کوئی جڑ تو اپنے ٹکڑے کی مثال نہیں بن سکتا، نہ ہی کوئی ٹکڑا خود چیز کسی وسیع چیز کا ہو

بہو نمونہ بن سکتی ہے، اس کے برعکس ایک وسیع چیز کی مثال، دوسری وسیع چیز سے پیش کی جاسکتی ہے، نیز یہ بھی معلوم ہو کہ صرف وسیع چیزیں ہی بیک وقت مخالفت و متضاد صفات کی حامل ہو سکتی ہیں، چنانچہ دنیا بھر کے پانی کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ٹھنڈا بھی ہے اور گرم بھی، میٹھا بھی ہے، اور کھارا بھی۔

ہماری بحث خدا کے بیک وقت ظاہر و باطن ہونے سے متعلق تھی، جس میں اس حقیقت کی تصدیق و توثیق ہوئی کہ کسی شک کے بغیر خدا ظاہر بھی ہے، اور باطن بھی، اگرچہ کائنات میں کوئی ایسی چیز نہیں جو خدا تعالیٰ کی صیح مثال پیش کر سکے، کیونکہ اس کی کوئی مثال نہیں، اور وہ خود اپنی مثال آپ ہے، تاہم خدا شناسی کے سلسلے میں نظام کائنات اور اصول حیات میں غور و فکر کر کے خدا کی معرفت میں آگے سے آگے بڑھتے جانا ہر مومن کا لازمی فرض ہے۔

جاننا چاہئے کہ خدا کی قدرت (توانائی) میں کوئی چیز ناممکن نہیں، اور ہر ممکن و ناممکن امر کو پرکھنے کے لئے جو معیار مقرر کیا گیا ہے، اس کی بنیاد زمانہ ماضی کے لوگوں کی محدود معلومات پر ہے، نہ کہ قانون قدرت اور حکمت قرآن کے عین مطابق، جس کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ اب سے کوئی ہزار برس قبل کے لوگ بن چیزوں کو ناممکن قرار دیتے تھے، اب اس ایٹمی دور میں ان میں سے بہت سی چیزیں ایسی ہیں، جو ناممکنات کی فہرست سے نکل کر ممکنات کی لسٹ میں مندرج ہو چکی ہیں، اور انسان علمی و فنی میدان میں جس برق رفتاری سے ترقی کر رہا ہے، اس کے پیش نظر یہ امر تعجب نہیں، کہ ایک زلزلے کے بعد ناممکنات کی

فہرست بالکل ہی ختم ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ کے نور کے لئے یہ کوئی مشکل نہیں، کہ وہ ظاہر اور باطن دونوں حال میں حاضر و ناظر رہے، جبکہ اس کی مخلوق میں بھی یہ مثال پائی جاتی ہے۔ چنانچہ ہم سورج کے متعلق یہ کہہ سکتے ہیں، کہ اس میں ظاہر اور باطن کی دونوں صفتیں موجود ہیں، اور وہ اس طرح کہ سورج دن میں ظاہر اور رات میں باطن ہے، پھر صاف آسمان پر ظاہر اور بادلوں کے پیچھے باطن ہے، نیز آ نکھ والوں کیلئے ظاہر، اور نابیناؤں کے لئے باطن ہے، اس کے علاوہ موصول شدہ روشنی و حرارت اور سامنے کے نصف قمر نظر آنے کے اعتبار سے ظاہر ہے مگر اصلی روشنی، بنیادی حرارت، اندرونی کیفیت، مجموعہ جسامت اور عقبی سطح نظر نہ آنے کے لحاظ سے باطن ہے۔

اسی طرح انسان ظاہر بھی ہے اور باطن بھی، اس کا ظاہر ہونا جسم کی نسبت سے اور باطن ہونا روح کے سبب سے ہے، نیز انسان جب گفتگو کرتا ہے تو ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ دانا ہے یا نادان، اور اگر وہ بولے تو باطن رہ جاتا ہے، اسی معنی میں مولانا علی علیہ السلام کا ایک ارشاد گرامی ہے، کہ آدمی اپنی زبان کے نیچے پوشیدہ ہے۔

اس حقیقت کی ایک اور دلیل، کہ خدائے تعالیٰ کے پاک نور کا مشاہدہ ممکن بھی ہے، اور ناممکن بھی، یہ ہے کہ وہ خود جل جلالہ فرماتا ہے کہ، لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ ۗ وَهُوَ يُبْصَرُ ۗ وَهُوَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۗ لَمْ يَلَمْسْهُ يَدٌ ۖ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ ۖ وَهُوَ ظَهِيرٌ لِّعَرْشِهِ ۗ عِلْمُ اللَّهِ شَامِلٌ لِّمَا لَا تَحِيطُ بِشَيْءٍ مِّنْهُ ۚ وَلَٰكِنِّي أُعِيِّنُكَ لَعِبْرَتٍ لِّكَ ۚ لَئِنْ رَأَيْتَ سَمَاءً مِّنْ دُحَانٍ فَإِنَّكَ تَرَىٰ ظَهْرَ رَبِّكَ ۚ تَبَارَكَ الَّذِي فِي يَدَيْهِ الْمَقَالِقُ ۚ ذُكِرْتُمْ فَتَبَرُّوۥا ۚ وَذُكِرْتُمْ فَتَسْتَغْفِرُونَ ۚ لَكُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ۚ

تک نہیں پہنچ سکتی ہیں، اور وہ خود اپنی صفات سے آنکھوں کو پہنچ سکتا

ہے، اس ارشادِ عالی سے یہ حقیقت ظاہر ہے، کہ کسی انسان کے دیدہٴ دل میں یہ طاقت نہیں کہ خدا کے نور کے آسمانِ رفعت تک پہنچ سکے، مگر ہاں نور خود بخود چشمِ بصیرت کے سامنے آجاتا ہے، جس طرح کہ معلوم ہے، کہ ہماری ظاہری نگاہیں سورج تک نہیں پہنچ سکتی ہیں، بلکہ وہ اپنی ہی روشنی کی وسعت سے ہماری نظروں میں سمو آتا ہے۔

پس گویا یہ جسمانی سورج بھی ہم سے یہی کہا کرتا ہے، کہ اے ابنِ آدم! دراصل تمہاری نظریں مجھ تک نہیں پہنچ سکتیں، اور نہ ہی تمہاری آنکھیں اپنے اندر مجھے سمو سکتی ہیں، کیونکہ میں ان سے نہایت ہی دور اور انتہائی عظیم ہوں، مگر امرِ واقع یہ ہے کہ میں خود ہی تمہاری آنکھوں تک پہنچ سکتا اور ان میں اپنے آپ کو سمو سکتا ہوں، تاکہ یہ ایک حقیر ہی مثال ہو کہ خدا کا نور کس طرح حقیقی مومن کے مشاہدے میں آ سکتا ہے۔

والسلام

مصنف کے متعلق پاکستان کے بعض سر بلند دانشوروں کی آراء

جناب محمود بریلوی صاحب (ڈاکٹر پروفیسر):

”مفتاح الحکمت“ کے مصنف جناب نصیر الدین نصیر ہونزائی صاحب محتاج تعارف نہیں ہیں، موصوف نے اس نوع کی متعدد کتابیں لکھ کر صوفی حلقوں سے تراجیح تخبین وصول کیا ہے، ”میزان الحقائق“ ان کی دوسری معروف و مقبول کتاب ہے۔

ہونزائی صاحب اسماعیلی واعظ و مبلغ کی حیثیت سے اپنی جماعت میں معزز و موقر ہیں، وہ شاعر بھی ہیں، اور انشاء پر داز بھی، روحانیات و نفسیات مددوح کے خاص موضوع ہیں، میزان الحقائق اور مفتاح الحکمت کی اشاعت سے اسماعیلی نظریات کی جو توجیہ موصوف نے کی ہے، وہ محتاج بیان نہیں، ان کی تحسیر نشائستہ اور انداز بیان دلپذیر ہے، جو ان مضامین کے دلدادہ ہیں، وہ یقیناً مطالعہ سے محفوظ و مسرور ہوں گے۔

محمود بریلوی (ڈاکٹر پروفیسر)

مصنف ”افریقہ میں اسلام“ انگریزی و دیگر کتب۔ جولائی ۱۹۶۶ء

جناب جون ایلیا صاحب :

یاں وہی ہے جو اعتبار کیا۔

میزان الحقائق :

مصنّف الواعظ نصیر الدین نصیر ہونزائی۔

کتاب کے مصنف جناب نصیر الدین نصیر ایک عالم و فاضل بزرگ ہیں، ان کا تعلق ریاست ہونزہ سے ہے، موصوف بُروشسکی زبان کے پہلے شاعر ہیں، بروشسکی کے علاوہ اُردو اور فارسی میں بھی شعر کہتے ہیں، ان کی شاعری بیان کے حسن، احساس کے خلوص اور فکر کی متانت کا بہترین امتزاج ہے، وہ بُروشسکی زبان کے ایک منفرد شاعر ہیں، انہوں نے خالص علمی اور فلسفیانہ موضوعات پر اُردو اور فارسی میں متعدد کتابیں لکھی ہیں، خاص طور پر اُردو ان کا پسندیدہ اور محبوب ذریعہ اظہار ہے، وہ صلے اور تائش سے بے نیاز ہو کر اُردو زبان کی خدمت میں مصروف ہیں۔ ریاست ہونزہ میں تصنیف و تالیف کی روایت انہیں نے شروع کی ہے، ان کی یہ ساعی اُردو دوسرے معلقوں کی طرف سے خاص حوصلہ افزائی کی مستحق ہیں، نصیر صاحب کی زیر تبصرہ تصنیف ”میزان الحقائق“ ان کے مفکرانہ اندازِ فکر کی پوری طرح نمائندگی کرتی ہے، وہ اُردو زبان میں باطنی علم اور فکر کے پہلے ترجمان ہیں۔

اس کتاب میں حقائقِ تنزیلی اور اصولِ تاویل کی روشنی میں حیات اور

کائنات کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے، اور اس بحث میں قدیم و

جدید افکار اور ان کے نتائج کو پوری طرح سامنے رکھا گیا ہے، کتاب کے چند عنوانات یہ ہیں: دائمی قیامت، عالمگیر روح کی عملی طاقت قیامت خیز ہے، الف میں نقطہ پوشیدہ اور صفر ایک سے آگے، مردہ ایٹم اور زندہ ایٹم، وغیرہ، ان عنوانات کے سلسلے میں موضوع سے متعلق مختلف اور گونا گون مسائل زیر بحث لائے گئے ہیں۔

جون ایلیا

جناب وزیرِ غلام علی الاتا صاحب:

میں نے فاضل محترم جناب نصیر الدین نصیر ہونزائی کی گر انقدر تصنیف ”منقح الحکمت“ دیکھی، اور اس کے فکر انگیز مباحث سے استفادہ کیا، میں فاضل موصوف کے علمی اور فکری خلوص کا قائل رہا ہوں، اور ان سے مختلف مسائل پر گفتگو کی ہے، نصیر صاحب کی علمی اور فکری تحریریں باطنی فلسفے کا بیش بہا پس منظر رکھتی ہیں، باطنی فلسفے نے مسلم ثقافت کو ایک گہری معنویت دینے میں جو کردار ادا کیا ہے، اسکا ابھی پوری طرح جائزہ نہیں لیا گیا۔ اس مکتبہ فکر نے دنیائے اسلام کے عظیم ترین ذہنوں کی تربیت کی ہے، اور اسلامی مشرق کے دوسرے فلسفیانہ مکاتب کو مختلف سطحوں پر متاثر کیا ہے۔ حمید الدین کرمانی، المؤید فی الدین شیرازی اور ناصر خسرو ایسے زعمائے فکر اسی عظیم الشان مکتبہ فکر کے پروردہ ہیں، دنیائے اسلام کی شہرہ آفاق تنظیم ”انحوان الصفا“ مکتبہ باطنیت ہی سے تعلق رکھتی ہے۔

فاضل محترم جناب نصیر ہونزائی نے اپنی گہراقدر تصنیفات میں اس نظام فکر کی نمائندگی کی ہے، اور ان حقائق کو زیر بحث لائے ہیں جو آج تک دقیق فکر کا موضوع بنے ہوئے ہیں، ان کی زیر نظر تصنیف "مفتاح الحکمت" بھی اسی ذیل میں آتی ہے، انہوں نے اس کتاب میں براہ راست قرآن کریم کے حوالے سے بعض مسائل پر اظہارِ خیال کیا ہے، میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان کی یہ کوشش علمی اور مذہبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

غلام علی الافغانی

۲۰ جنوری ۱۹۶۷ء

جناب غلام سرور صاحب

ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی (علیگ)؛

میزان الحقائق؛ میں نے اس کتاب کا مطالعہ غائر نظر سے کیا

ہے، کتاب کے مصنف اور کتاب کے متعلق میری رائے حسب ذیل ہے؛
مصنف علومِ دینیہ سے کامل واقفیت رکھتے ہیں، قرآن مجید کے حقائق و معارف پر ان کو عبور حاصل ہے، احادیثِ نبویؐ کے سمجھنے پر بھی قدرت رکھتے ہیں، علمِ فلسفہ اور علمِ منطق میں ان کو دسترس حاصل ہے، اردو زبان اچھی جانتے ہیں، اور اپنے مافی الضمیر کو آسانی کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔
کتاب کے موضوعات، کتاب کے نام سے ظاہر ہیں، یہ کتاب ایسے حقائق اور ان کی توضیحات پر مشتمل ہے جن کا جانا موجودہ دور کے انسانوں کے لئے

از میں ضروری ہے، البتہ یہ بات بلا خوف و خطر کہی جاسکتی ہے، کہ اس کتاب کے موضوعات معنی اور مطالب کے اعتبار سے ادق اور مشکل ہیں، اور ان کا سمجھنا ایک عامی کے بس کی بات نہیں، خواص ہی انہیں سمجھ سکتے ہیں، اور ان سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

ایک چیز ضرور کھٹکتی ہے، اور وہ ہے ان مشکل مباحث کی توضیحات کا اختصار، قاری مطالعہ کے بعد تشنگی محسوس کرتا ہے، اور حقائق کی مزید وضاحت کا طالب ہوتا ہے، جو اسے موجودہ کتاب میں نہیں ملتی۔

بہتر ہوتا، اگر صاحب تصنیف ان موضوعات کی مزید توضیح فرماتے، اور تشنگانِ وادی حقائق کی پیاس بجھاتے، یہ ایک دینی خدمت ہے، خداوندِ تعالیٰ فاضل مصنف کو اس سے زیادہ خدمت کی توفیق بخشے!

غلام مسرورہ ایم۔ اے، پی۔ اے۔ اے۔ ڈی (علیگ)
پروفیسر اینڈ ہیڈ، ڈیپارٹمنٹ آف پشین، یونیورسٹی آف کراچی

۱۸/۴/۱۹۶۷

جناب جون ایلیا صاحب :

وجدِ دین، مصنف: حکیم ناصر خسرو

مترجم: الواعظ نصیر ہونزائی

چوتھی صدی ہجری کا فلسفی شاعر، حکیم اور فلسفی ناصر خسرو ایک ہمہ گیر شخصیت

کا مالک تھا، فلسفہ و حکمت کی کئی گران مایہ کتابیں ان کی یادگار ہیں، جن میں زاد المسافرین، جامع الحکمتین اور نوحان الاخوان کو نمایان حیثیت حاصل ہے، ان کے علاوہ ایک ضخیم دیوان اشعار ہے، جو فارسی ادب میں ایک بیش قیمت ذخیرے کی حیثیت رکھتا ہے، ناصر خسرو غالباً وہ پہلا شاعر ہے جسے حکیم کے لقب سے یاد کیا گیا۔ ”وجہ دین“ ناصر کی مشہور و معروف تصنیف ہے جو امور دنیویہ اور مسائل شرعیہ سے بحث کرتی ہے، ناصر ان امور اور مسائل میں بھی علم و حکمت کو ملحوظ رکھتا ہے۔

باطنی فلسفے کے دقیق النظر عالم اور بر روشنی اور فارسی زبان کے شاعر جناب الواعظ نصیر ہوندرائی نے وجہ دین کا اردو ترجمہ کیا ہے، جو اس وقت ہمارے پیش نظر ہے، موصوف قابل داد ہیں کہ انہوں نے ناصر کے علمی و استدلالی لہجے اور قدیم ترین فارسی طرز نگارش کو، جس کا ترجمہ سخت ریاضت چاہتا ہے، بڑی خوش اسلوبی اور روانی کے ساتھ اردو میں منتقل کیا ہے، مجھے بھی ناصر خسرو کی دو فلسفیانہ کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے کا موقع ملا، اور مجھے پوری طرح اندازہ ہے کہ ناصر کو شگفتگی اور روانی کے ساتھ منتقل کرنا کس قدر دشوار ہے، ناصر عام طور پر فلسفے کی مانوس عربی اصطلاحات کے بدلے فارسی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں، جن کے باعہ مفہم و معانی میں کافی دشواری پیش آتی ہے، یوں بھی ناصر کی فارسی سعدی۔ ل کی فارسی ہے اور علمی فارسی، لیکن ان تمام حقائق کے وصف نصیر صاحب نے ایسی سلاست کے ساتھ ترجمہ کیا ہے کہ ترجمے میں خود اصل اشکال بھی رفع ہو گیا ہے، اور محض اس لئے

ممکن ہو گیا کہ قاضل مترجم خود بھی ایک جامع اور ہمہ گیر شخصیت کے مالک ہیں، وہ اسلامی فلسفے پر گہری نظر رکھتے ہیں، عالم دین ہیں، اور پھر ایک شعلہ بیان شاعر، اور پھر یہ کہ وہ حکیم ناصر خسرو کی فکر کے پاکستان میں سب سے بڑے محرم ہیں، یہ ترجمہ ”دارالحکۃ الاسماعیلیہ“ ہونزہ، گلگت نے شائع کیا ہے، کراچی میں ملنے کا پتہ ”عباسی کتب خانہ جو نا مارکیٹ“ ہے۔

جون ایلیا

(عالمی ڈائجسٹ بشمارہ اگست ۱۹۶۸ء)

Institute for
Spiritual Wisdom
and
Luminous Science
Knowledge for a united humanity

پہلا دیدار اور پہلی کرامت

یہ ماہ دسمبر ۱۹۴۵ء کا زمانہ تھا ، جب کہ میں آرمی سے ریلیز (RELEASE) ہو کر جبل پور سے بمبئی پہنچ گیا ، جس کا واحد مقصد یہ تھا کہ میں امام عالی مقام علیہ السلام کے دیدارِ اقدس کی سعادت حاصل کروں ، اور نظارہ جشنِ جواہر (ڈائمنڈ جوبلی) سے آنکھیں پر لور ہو جائیں ، چنانچہ بمبئی پہنچتے ہی معلوم ہوا کہ حضرت مولانا امام سلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ کی تشریف مبارک پونا گئی ہے ، اشتیاقِ دیدارِ شدید اور عروج پر تھا ، لہذا کسی انتظار کے بغیر میں بطرفِ پونا روانہ ہو گیا ، اس انتہائی سعید سفر میں بڑی عجیب بات ہوئی کہ ہم چار بھی مٹھے اور پانچ بھی ، یعنی چار قبیلوں کے پانچ افراد :

(۱) کاکوز برنجان ، جو میرے عزیز دوست موکھی عرب خان کے بھائی ہیں ، جن کا تعلق درامیتک

سے ہے -

- (۲) کا کو نگاہ شاہ (برائٹنگ) اور ان کی والدہ مم فیروزہ
 (۳) نن گلاب شاہ، شاہ علی کڈ، خسرو کڈ -
 (۴) اور یہ بندہ ناچیز بُروکٹ -

ہم بذریعہ ریل گاڑی قتر بیٹا شام کے وقت پونا پہنچ گئے، رات انتظار دیدار کی بے قدری اور طرح طرح کی نیک دعاؤں میں بسر ہو گئی، اور صبح صادق نوید دیدار معشوق لیسر نمودار ہوئی، شاید آٹھ یا نو بجے کے درمیان کا کوئی وقت تھا، ہم اپنے دل کی عاجزانہ کیفیات و خواہشات کے ساتھ دیدار گاہ میں حاضر ہوئے، کچھ دیر سے آنے کی بنا پر صفِ آخرین میں کہیں جگہ ملی، دلِ شاہِ دلایت کے بادۂ عشق سے معمور اور جان اس کی لِقار کے شوق سے معمور ہو رہی تھی، اب زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ امام زمان علیہ السلام کی تشریف آوری کی علامت ظاہر ہوئی، اور مقدس اجتماع نے ہم آہنگ و یک زبان ہو کر صلوات بابرکات کا ورد شروع کر لیا، اتنے میں ہمارے مولائے نامدار کی کار (CAR) نظر آئی، نماز مشتاق نگاہیں اسی برگزیدہ محبوب کی جانب جا رہی تھیں، حضور پر نور درخشان و تابان موٹر سے باہر

نکلنے ہوئے قدم مبارک زمین پر رکھ رہے تھے کہ زمین کشتی برآب کی طرح دائیں بائیں ہلنے لگی، مجھ سے بے اختیار صدائے ”یا علی یا علی“ بلند ہوئی، میرا گمان تھا کہ نور امامت کی یہ کرامت تمام حاضرین نے محسوس کی ہوگی، لہذا میں نے کچھ اضطراب کے عالم میں ننگلاب شاہ اور ساکو نگاہ شاہ (جو میسر پاس تھے) سے کہا کہ زلزلہ یعنی بھونچال آیا، انہوں نے کہا کہ نہیں، حالانکہ اس زلزلہ قیامت سے میں دائیں بائیں گرنے پر تلتا تھا اور دونوں ہاتھوں کا سہارا لیکر بچ گیا تھا، اس عجیب و غریب واقعہ سے مجھے انتہائی حیرت ہوئی اور میں خاموش ہوا۔

اُس زمانے میں یہ عاجزہ بندہ علم اور روحانیت کا طفل شیر خوار تھا، لہذا اس واقعہ کو امام برحقؑ کی کرامت قرار دینے کے باوجود اس کی پُر حکمت اشارتوں کو سمجھنے سے قاصر تھا، مگر جب بفضیلِ خداوندِ قدوس یہ حقیقہ آگے چل کر روحانی انقلابات و تجربات سے گذر گیا، تو اس میں ہر طرح کی علمی سختگی آگئی، چنانچہ اسرارِ روحانیت کی روشنی میں عرض کی جاتی ہے کہ قرآن پاک میں جہاں جہاں زلزلہ کا ذکر ہے (۲۱۴، ۲۲، ۲۳، ۹۹) وہاں چار قسم کے بھونچال کا بیان فرمایا گیا ہے :-

- (۱) زمین کے جسم کثیف کا زلزلہ۔
 (۲) زمین کے جسم لطیف کا زلزلہ۔
 (۳) انسان کا ظاہری بخار / لرزہ (زلزلہ) یا کپکپی، اور
 (۴) آدمی کا باطنی بخار، جو جسم لطیف سے تعلق رکھتا
 ہے، جس کے کئی مراتب ہیں۔

اس موقع پر میں بعدِ خلوص یہ بھی عرض کروں
 کہ مددِ لیشی اور روحانیت کے اعلیٰ مراحل میں لطیف
 زلزلوں کا تجربہ لازمی ہے، کیوں کہ یہ ان روحانی
 وسائل میں سے ہیں، جن سے نفس کا تزکیہ ہو جاتا ہے،
 جیسا کہ قرآنی ارشاد ہے:

جب زمین اس کے بھونچال سے ہلا ڈالی جائے، اور
 زمین اپنے اندر کے سارے بوجھ نکال کر باہر ڈال دے،
 اور انسان کہے گا کہ یہ اس کو کیا ہو رہا ہے؟ اس دن
 وہ اپنے حالات بیان کرے گی کیونکہ تیرے رب نے لے
 حکم دیا (۹۹)۔

یہاں ارض سے عالمِ شخصی کی زمین (نفس) مراد ہے، اور
 اسی کی صلاحیتوں میں سے ایک خاص صلاحیت کپکپی یعنی زلزلہ
 ہے، انسان کے باطن میں بہت سے بوجھ (اَثقال) ہیں،
 جو غفلت، جہالت، نامردمانی وغیرہ کے نام سے ہیں،

جب کوئی خوش نصیب درویش بوسیلاً زلزلہ نفسانی
 کدورتوں کے بارگراں سے سبک دوش ہو جاتا ہے ، تو
 تب ہی وہ معجزانہ خطاب نسنے کے لئے آگے جاسکتا
 ہے ۔

سوال :- اگر عزیزوں میں سے کوئی مجھ سے یہ پوچھے
 کہ شروع ہی میں معجزہ زلزلہ دکھایا گیا ، اس کی
 تخصیص میں کیا حکمت پوشیدہ ہے ، جب کہ کوئی دوسرا
 معجزہ بھی ممکن تھا ؟ میں اس کا جواب عرض کروں
 گا کہ یہ معجزہ جیسا کہ قرآن میں ذکر ہے قیامت کی
 علامتوں میں سے ہے ، چونکہ حضرت مولانا امام
 سلطان محمد شاہ علیہ السلام بلا واسطہ یا بالواسطہ
 زمانہ قیامت کے امام تھے ، لہذا معجزہ زلزلہ سے
 ذاتی یا اجتماعی قیامت کا اشارہ فرمایا گیا۔

حس طرح ہر چیز کی حقیقی پہچان (معرفت)
 روحانیت میں ہو سکتی ہے ، اسی طرح قیامت کی
 شناخت بھی روحانیت ہی میں ہوتی ہے ، مگر اس
 کے نتائج کے طور پر بڑے بڑے انقلابات دنیائے
 ظاہر میں آتے ہیں ، اس کا مطلب یہ ہوا کہ

۱۸۴

عصر حاضر کے باطن میں بہت بڑی قیامت برپا
ہوئی ہے ، اسی لئے بڑی تیسزی سے ظاہری حالات
بدل رہے ہیں ۔

N. N. H

21 - 11 - 92 . KARACHI

Institute for
Spiritual Wisdom
and
Luminous Science

Knowledge for a united humanity

Table of Contents

